اخلاقی وروحانی بیماریوں کے نقصانات اوران کا علاج

ترکِ رذائل

احمد جاوید

مرتب

ڈاکٹر محمد امین

ترکِ رزائل

یعنی اخلاقی بیماریوں کے نقصانات اور ان کا علاج

احمد جاوید

مرتب: ڈاکٹر محمد امین

فہرست مضامین

پیش لفظ

تزکیۂ نفس کے لیے مسلمانوں کے قائم کردہ ادارے کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس میں مسترشدین اپنے مربی سے غایت درجے کی محبت اور اس کی انتہائی تکریم کرتے ہیں جو بسا اوقات مبالغے پر جا منتج ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے جناب احمد جاوید سے محبت کرنے والے اور ان سے استفادہ کرنے والے بعض افراد اگر انہیں غزالیٔ دوراں یا رومیٔ ثانی سمجھتے ہیں تو اس کا جواز سمجھ میں آتا ہے۔ البتہ ہماری رائے میں احمد جاوید صاحب کی جاذبیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ تزکیۂ نفس کے حوالے سے وہ نہ صرف اسلاف کے علم، تجربے اور تقویٰ کے امین ہیں بلکہ ان کے تنقیدی شعور نے انہیں تصوف کی مروّجہ خرابیوں سے دور ہونے کا موقع بھی فراہم کیا ہے اور اہل تزکیہ کی روایتی دانش کے ساتھ جدید نفسیات اور فلسفے میں ان کا تعمق اس پر مستزاد ہے۔

مجھ جیسے لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ جناب احمد جاوید کی عزلت پسندی اور شہرت سے گریز کی وجہ سے ان سے استفادہ محدود ہے لہٰذا اس کا کوئی حل نکالنا چاہیے (یہ سطور بھی ان کو دکھائے بغیر شائع کی جارہی ہیں ورنہ وہ اس کی بھی اجازت نہ دیتے)۔ ہم نے انہیں تصنیف و تالیف کی طرف مائل کرنا چاہا لیکن ان کے شاعر و ادیب ہونے اور قلم پر دسترس رکھنے کے باوجود ہمیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور ان کی 'تصنیف رجال' کی مشغولیت اور مخصوص ذوق و مزاج اس میں آڑے آیا۔ اس کا حل راقم نے یہ سوچا کہ کسی خاص موضوع پر ان سے تنہائی میں گفتگو کروں اور بعد میں اسے قلم بند کرلوں لیکن یہ تجربہ ابتداء ہی میں ناکام ہوگیا کیونکہ معقولات کا فاضل ہونے کی وجہ سے ان کا اسلوب عمیق اور ادق ہوتا ہے اور راقم سوئے اتفاق سے، کبھی

معقولات کا طالب علم نہیں رہا لہٰذا ان کی گفتگو میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی اور میں اسے بعد میں صحیح طور پر قلم بند نہ کر پاتا۔ اس پر انہوں نے میری یہ تجویز مان لی کہ وہ مجھے املا کروا دیا کریں، اگرچہ میری تجاویز اور مشورے (بلکہ دخل در معقولات) ساتھ جاری رہتا جسے وہ مناسب سمجھتے تو قبول کر لیتے۔ ان کی (اور کچھ میری) مصروفیت کی وجہ سے ہم اس کے لیے ہفتے میں صرف ایک دن نکال پاتے اور وہ بھی عصر سے مغرب تک اور اس میں بھی رمضان شریف کے علاوہ، بوجوہ، کافی ناغے ہوتے رہتے۔ یوں یہ کتاب، جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، تقریباً اڑھائی سال میں مکمل ہوئی۔ پھر اس کی ترتیب و تخریج کے بعد اشاعت کے روایتی مراحل نے بے حال کیے رکھا۔ بہر حال، اب یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کام کا بنیادی خاکہ یہ تھا کہ اصلاحِ اعمال و اخلاق کے دو اساسی پہلو ہیں: ایک رذائل و منکرات و معصیت سے بچنا اور دوسرے خیر، معروف اور فضائل کا اکتساب۔ خیال یہ تھا کہ تین چار سو صفحات کی ایک کتاب میں ان دونوں پہلوؤں کو سمیٹا جا سکے گا لیکن جب ترکِ رذائل والے حصے کے مرتب کرنے میں طویل مدت لگ گئی اور مباحث بھی کچھ پھیل گئے تو خیال آیا کہ اسے حصۂ اول کے طور پر الگ شائع کر دیا جائے۔ دوسرے حصے پر اس وقت تقریباً اسی سست رفتار سے کام جاری ہے اور مکمل ہونے پر اسے الگ سے شائع کر دیا جائے گا، ان شاء اللہ۔

میرے ذہن میں جناب احمد جاوید صاحب کے ساتھ مل کر کام کرنے کے مزید کئی منصوبے ہیں مثلاً:

- قرآنِ حکیم کی تفسیر، تزکیہ و تربیت کے نقطۂ نظر سے
- مغربی نفسیات اور فلسفے پر نقد اور مسلم نفسیات اور فلسفے کی عصری تناظر میں تشکیلِ جدید و تدوینِ نو۔
- عصر حاضر میں تزکیۂ نفس کے ادارے کی تشکیلِ نو۔

ظاہر ہے یہ سب بڑے علمی منصوبے ہیں (اور ان پر مستزاد وہ عملی منصوبہ ہے جس میں راقم کے پیشِ نظر احمد جاوید صاحب کے زیرِ نگرانی ایک نئی طرز کے تربیتی مرکز [جدید خانقاہ] کا قیام ہے جہاں طالبانِ تزکیہ کچھ عرصہ قیام کر سکیں) لیکن عملاً کیفیت یہ ہے کہ ان کے پاس وقت ہے (اور نہ میرے پاس)۔ منجملہ دیگر دینی مصروفیات کے وقت کا بڑا حصہ ہماری ملازمتیں لے جاتی ہیں اور صحت کا معاملہ بھی دونوں طرف کچھ ایسا ہی ہے۔ اپنی برسوں کی خواہش اور کوشش کے باوجود ابھی تک ایسے وسائل میسر نہیں آ سکے کہ وہ یا میں ان کاموں کے لیے فارغ ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اخلاص عطا فرمائیں، کام کے موانع دور فرمائیں اور اپنی رضا و توفیق سے نوازیں۔

اس کام کی افادیت اور فنی پہلوؤں پر گفتگو میں دوسرے اہلِ علم کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

''ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم''

محمد امین

لاہور
یکم مارچ ۲۰۰۵ء

باب اوّل

تمہیدی مباحث

دین کا اصل مقصود

س: اسلام کا اصل مقصود کیا ہے؟

ج: اللہ کی رضا کا حصول، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ (الفتح ۴۸:۲۹)

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھی ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم انہیں رکوع میں اور سجدے میں دیکھو گے۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔

نیز دیکھئے البقرہ ۲:۲۰۷ اور المائدہ ۵:۱۶ وغیرہ۔

س: اس مقصد کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟

ج: اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاریات ۵۱:۵۶)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی اور اطاعت کریں۔''

﴿وَمَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى﴾ (طٰہٰ ۲۰:۷۵) ''اور جو شخص اللہ کے ہاں مومن ہو کر آئے گا اور اس نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے تو ایسے لوگوں کے لئے بڑے اور اونچے درجے ہوں گے۔''

نیز دیکھئے المائدہ ۵:۱۱۹، اور آلِ عمران ۳:۸۵ وغیرہ۔

س: بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اصل مقصد جنت کا حصول ہے؟

ج: غالباً ''اصل مقصد'' کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہوئی ہے ورنہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا کا یقینی نتیجہ جنت ہے تو دونوں لازم وملزوم ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں کئی جگہ فرمایا گیا ہے (دیکھیے مثلاً المائدہ ۵:۱۱۹، اور التوبہ ۹:۱۰۰)

س: بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصل چیز تقرب الی اللہ ہے؟

ج: رضائے الٰہی کے حصول اور تقرب الی اللہ میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے، محض عنوان کا فرق ہے۔ تقرب کا نتیجہ بھی جنت ہے (الواقعہ ۵۶:۱۱، ۸۸، ۸۹ وغیرہ) اور مومن جنت میں اعلیٰ درجات کی تمنا اسی لئے کرتے ہیں کہ وہاں تقرب زیادہ ہے۔

س: بعض لوگ اس کے لئے وصول الی اللہ کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں؟

ج: یہ قرآن وسنت کی نہیں، بعض صوفیا کی اصطلاح ہے۔ اگر اس کے ڈانڈے وحدۃ الوجود اور حلول سے ملائے جائیں تو یہ نا قابل قبول ہے۔ اور اگر اس کے معنی بعض عملی صوفیا کی طرح ''اللہ کے رنگ میں رنگے جانا'' لئے جائیں تو یہ شرعی اعتبار سے درست ہیں (دیکھیے البقرہ ۲:۱۳۸) اس لحاظ سے وصول اِلی اللہ کے معنی تقرب اِلی اللہ ہی کے ہوں گے گو وصول میں شدت اور مبالغہ ہے۔ تاہم یہ اصطلاح چونکہ اپنے غلط استعمال کی ایک طویل تاریخ رکھتی ہے لہذا اسے استعمال کر کے ہم محفوظ پوزیشن میں نہیں رہیں گے اور جس چیز میں خرابی کا احتمال ہو اس کا ترک اولیٰ ہے، لہذا اس مقصد کے لئے یہ اصطلاح استعمال نہیں کرنی چاہیے۔

س: صبغۃ اللہ کی یہ کیفیت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟

ج: اللہ کا رنگ آدمی پر اس وقت چڑھتا ہے جب وہ اللہ سے محبت کرنے لگے اور اللہ اس سے محبت کرنے لگے اور اس کا طریقہ ہے اطاعتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی اتباعِ سنت

جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران ۳:۳۱)

''اے نبی! آپ ان لوگوں سے کہیں کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔''

س: اللہ کا محبوب بننے کے لئے اتباع سنت ضروری ہے لیکن کیا محبّ بننے کے لئے بھی یہ ضروری ہے؟

ج: اتباع سنت پورے دین کا لازمی تقاضا ہے۔ پورے دین کا مطلب ہے ایمان اور عمل صالح (البینہ ۹۸:۷ اور مریم ۱۹:۹۶ وغیرہ)۔ عمل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا حکم ابھی آپ نے پڑھا، ایمان میں بھی اتباع لازمی ہے بلکہ ایمان پورے کا پورا اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا نام ہے۔

س: ایمان کو اتباع رسول کہنے کا مطلب کیا ہے؟

ج: پہلا مطلب یہ ہے کہ ایمان ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر یقین کرتے ہوئے ہی لاتے ہیں، اس جہت سے محرکِ ایمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ٹھہرا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایمان جن عقائد کا مجموعہ ہے انہیں لفظاً لفظاً انہی معانی میں مانا جائے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح اور یقینی طور پر ثابت ہیں۔ ان میں کسی بھی عنوان سے کوئی تبدیلی یا کمی بیشی جائز نہیں۔

س: صحیح ایمان لانے کی لازمی پہچان کیا ہے؟

ج: مقتضیات ایمان پر عمل یعنی ایمان کا ہر جزو ہم سے کچھ اعمال کا تقاضا کرتا ہے۔ ا تقاضے کو پورا کر کے ہی یہ ثابت ہوگا کہ ہم ایمان پر اچھی طرح سے قائم ہیں۔

س: مقتضیات ایمان پر عمل کے لازمی نتائج کیا ہیں جو ہر کس و ناکس مشاہدہ کر سکے؟

ج: ارکان ایمان تین ہیں: ❶ توحید ❷ رسالت ❸ معاد (آخرت)

توحید کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی شرک بلکہ احتمال شرک کے بھی قریب نہ جائے، صرف اسی کی عبادت کرے، صرف اسی سے مدد مانگے، صرف اسی کو خالق و مالک اور رازق جانے۔ زندگی اور موت، عزت و ذلت، خوشی و غم، نفع اور نقصان سب اسی کے قبضہ قدرت میں سمجھے وغیرہ۔ رسالت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر نبی کریم ﷺ کی پیروی کرے اور معاد کا تقاضا یہ ہے کہ معصیت کو ترک کرے اور آخرت کو یاد رکھے۔

س: یہ سب باتیں تسلیم! مگر ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات آدمی چاہنے کے باوجود مطلوبہ اعمال بجا نہیں لا پاتا اس کا سبب کیا ہے؟

ج: اس کے بنیادی اسباب دو ہیں: ❶ ضعفِ ارادہ ❷ نقصِ طبیعت

س: ارادے اور طبیعت کی اصلاح کیسے کی جائے؟

ج: نیت کو خالص کیا جائے یعنی ہر کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اور اس کے احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جائے۔ یہاں تک کہ حسن نیت بالآخر شعور سے تجاوز کر کے طبیعت کا داعیہ بن جائے۔ یہی اخلاص ہے۔

س: حسن نیت پیدا کرنے کی تدابیر کیا ہیں؟

ج: اس کی تدابیر کے بیان سے پہلے یہ سمجھ لیا کہ طبیعت میں بگاڑ پیدا ہونے کے کچھ اسباب و محرکات ارادی و شعوری ہوتے ہیں اور کچھ غیر ارادی و لاشعوری۔

پہلے ہم فسادِ نیت کے ارادی و شعوری اسباب کے ازالے کی تدابیر بیان

کرتے ہیں:

— فسادِ نیت کے ارادی اسباب کا علاج ہے تعلق بالصلوٰۃ، اور

— فسادِ نیت کے شعوری اسباب کا علاج ہے تعلق بالقرآن۔

س: اور فسادِ نیت کے غیر اختیاری اور لاشعوری اسباب کا علاج کیا ہے؟

ج: فسادِ نیت کے غیر ارادی محرکات کا علاج استغفار ہے اور اس کے لاشعوری محرکات کا علاج ذکر ہے۔

س: تعلق بالصلوٰۃ سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: نماز میں بہتری کی تمام صورتیں اختیار کرنا مثلاً اذان کا جواب دینا، اچھی طرح وضو کرنا، زینت اختیار کرنا، ذکر کرتے ہوئے مسجد جانا، جماعت سے پہلے اچھی نماز کے لئے دعا کرنا، اقامت کا جواب دینا، قرأت پر دھیان جمانا......وغیرہ

س: اور تعلق بالقرآن سے آپ کی مراد کیا ہے؟

ج: تلاوت کرنا

مقررہ حدود میں رہ کر تدبر کرنا۔

قرآنی احکام کی تعمیل کرنا۔

س: فسادِ نیت کے غیر اختیاری محرکات کا علاج آپ نے استغفار بتایا تھا۔ استغفار سے یہاں کیا مراد ہے؟

ج: اس کا مطلب ہے زبان کو طلب مغفرت کے مسنون صیغوں میں مشغول رکھنا اور دل کا اس کی کیفیت سے معمور رہنا۔

س: اور ذکر سے کیا مراد ہے؟

ج: ذکر سے مراد یہ ہے کہ تسبیح،تحمید،تہلیل،تقدیس وغیرہ کے مسنون کلمات (مثلاً سبحان اللّٰہ، الحمدللّٰہ،اللّٰہ اکبر،لاالہ الااللّٰہ، لاحول و لاقوۃ الّا باللّٰہ وغیرہ)میں زبان کو ایسے اہتمام کے ساتھ مشغول رکھنا کہ دل اس کا اثر محسوس کرے۔

س: آپ نے بتایا تھا کہ طبیعت کے تزکیے کا نتیجہ اخلاص ہے،یہ بھی بتادیجیے کہ طبیعت کے تزکیے کے اصول کیا ہیں؟

ج: یہ اصول تین ہیں: ❶ تعلیم ❷ تذکیر، اور ❸ صحبت

— تعلیم سے مراد ہے دین کے مقاصد اوران کے حصول کے ذرائع کا علم۔

— تذکیر سے مراد ہے ان مقاصد اور ذرائع کا استحضار،اور

— صحبت سے مراد ہے صحیح العقیدہ والعمل حضرات کی ہم نشینی ورفاقت۔

س: اور طبیعت کے تزکیے کی عملی شرط کیا ہے؟

ج: رغبت پیدا کرنا

س: اور ترغیب کے ذرائع کیا ہیں؟

ج: ترغیب کے ذرائع تین ہیں:

۱۔ محبت،ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے

۲۔ محبت،اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے

۳۔ استحضار جنت

س: فسادِ نیت کی بات شروع ہونے سے وہ بات تو بیچ میں ہی رہ گئی کہ حسنِ نیت پیدا کرنے کی تدابیر کیا ہیں؟

ج: حسن نیت پیدا کرنے کی اصولی تدابیر دو ہیں، گو شخصی ضروریات کے حوالے سے ان کی تفصیل میں کچھ اختلاف ہوسکتا ہے:

ایک: ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنا، اللہ کی حمد پر ختم کرنا اور اس کے مطلوبہ نتائج کے حصول کے لئے اپنی کوششوں اور صلاحیتوں سے زیادہ اللہ کے فضل پہ انحصار کرنا۔

دوم: جس کام کے بارے میں یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ اس کے پیچھے حسن نیت کارفرما نہیں ہے اس کام کو، اس کی نوعیت کے اعتبار سے، یا تو: (۱) چھوڑ دینا، یا (۲) موقوف کر دینا، یا (۳) دہرالینا۔

س: یہ دونوں تدابیر اجمالاً تو سمجھ میں آ گئیں لیکن بعض چیزوں کی وضاحت مطلوب ہے مثلاً پہلی تدبیر میں کیا اللہ کے فضل پر انحصار کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اپنی سعی کے مقابلے میں دعا پر زیادہ زور اور انحصار مطلوب ہے؟

ج: یہ بات جزواً صحیح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوشش اور استعداد دونوں اللہ ہی کی دین ہیں لہذا اللہ کی ان نعمتوں کو پوری طرح استعمال کرتے ہوئے نتائج کے حصول کے لیے دعا کرتے رہنا زیادہ مفید عمل ہے۔ بلکہ کوشش بھی تو دراصل زبانِ حال سے دعا ہی ہے۔

س: اور دوسری تدبیر میں آپ نے فساد نیت کے ساتھ کیے جانے والے کاموں کے بارے میں جو تجاویز دی ہیں ان کی تفصیل کیا ہے؟

ج: پہلی تجویز ایسے کام کے ترک کی تھی۔ اس تجویز پر عمل اس صورت میں ہوگا جب وہ کام محض ایک شخص کے ذاتی فائدے کا ہو اور شرعی طور پر واجب نہ ہو۔ اس کی مثال

اس تاجر کی ہے جو اناج کی تجارت کرتا ہو۔ اگر اس کی نیت میں یہ فساد آ جائے کہ وہ ذخیرہ اندوزی سے زیادہ منافع کمائے تو اسے چاہیے کہ اجناس کی تجارت چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی تجارت شروع کر دے۔

دوسری تجویز ایسے کام کو وقتی طور پر موقوف کر دینے کی تھی۔ اس تجویز پر عمل ان دنیاوی کاموں میں ہوگا جن میں شرعی فائدہ بھی ہے مثلاً ایک شخص ایک مسجد و مدرسے میں ملازم ہے اور اس کے ذمہ جمعہ کا وعظ کہنا بھی ہے۔ اب اگر اس کی نیت میں فساد آ جائے اور فی سبیل اللہ لوگوں کی تعلیم اور اصلاح کی بجائے خود کو بڑا عالم اور مقرر کہلوانا اس کی نیت میں شامل ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وعظ کہنا اس وقت تک موقوف کر دے جب تک اس کی نیت کی اصلاح نہ ہو جائے اور وعظ کی بجائے وہ تدریس کی یا کوئی دوسری ذمہ داری اپنے سر لے لے۔

تیسری تجویز اس عمل کو دہرانے کی تھی۔ اس کی مثال نفلی عبادات و اذکار ہیں مثلاً ایک آدمی نے مسجد میں اوابین کے نفل پڑھے اور اس میں ریا کی نیت شامل ہوگئی تو وہ گھر آ کر ان کو دہرا لے تا کہ اس کا اجر ضائع نہ ہو۔

س: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خوف سے طبیعت کا تزکیہ ہوتا ہے جبکہ بعض کی رائے میں جزا کی امید اس میں موثر ہوتی ہے؟ آپ کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

ج: یہ دونوں خیال جزوی صداقت رکھتے ہیں۔ تزکیۂ طبیعت میں ترغیب بھی ضروری ہے اور ترہیب بھی۔ طبیعت کی وہ سطح جو جبلتوں اور ان کے داعیات سے عبارت ہے، ترغیب سے متاثر ہوتی ہے اور طبیعت کا وہ مرتبہ جو ذہنی اور عقلی ہے وہ ترہیب سے اثر قبول کرتا ہے۔

س: ایسا کیونکر ہے؟

ج: اس کی وجہ یہ ہے کہ طبیعی داعیات کا ہدف جلب مسرت ہے جبکہ ذہن اور عقل کا مقصود دفع مضرت ہے۔ جس کا ہدف جلب مسرت ہوگا اس میں ترغیب ہی کی قبولیت پائی جائے گی۔ وہ جنت کی طرف تو مائل ہوسکتی ہے دوزخ کی آگ کے بیان سے متاثر نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح مقصود اگر دفع مضرت ہو تو جنت کی کشش دوزخ کے خوف سے مغلوب ہو جائے گی۔

س: کیا ترغیب وترہیب کوئی تبلیغی اور تعلیمی امر ہے؟

ج: کسی حد تک تو ہے لیکن اس کا مناسب ترین وسیلہ صحبت ہے جس کی تعریف ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

س: یہ جاننے کے باوجود کہ ترغیب وترہیب کا مدار صحبت پر ہے، یہ سوال اپنی جگہ پر برقرار رہتا ہے کہ آخر ان کے کچھ اصول اور ذرائع تو ہوں گے جن کی روشنی میں اور جن کی مدد سے یہ دونوں عمل بخوبی سرانجام دیے جاسکیں؟

ج: ترغیب کے ذرائع کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں یعنی:

۱۔ ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

۲۔ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

۳۔ جنت کا استحضار

جہاں تک ترہیب کا تعلق ہے تو اس کا اصول ہے ''اللہ کی پکڑ کے تصور کو زندہ حالت میں رکھنا''۔

س: ترغیب وترہیب کے نتیجے میں وہ کون سے فضائل حاصل ہوتے ہیں جو شریعت میں بھی معتبر ہیں؟

ج: تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے مختصراً یہ سمجھ لیں کہ ترغیب سے بالآخر ترکِ غفلت کی فضیلت میسر آتی ہے اور ترہیب سے ترکِ معصیت کی توفیق حاصل ہوتی ہے اور پوری شریعت ترکِ غفلت اور ترکِ معصیت ہی کا نام ہے۔

س: ترکِ غفلت اور ترکِ معصیت کو پوری شریعت آپ نے کس اعتبار سے کہا ہے؟

ج: دیکھیے! شریعت کے دو اصولی تقاضے ہیں: صحیح عقیدہ اور صالح عمل یا یوں کہہ لیں کہ سچا ایمان اور پکی اطاعت، اور یہ دونوں حالتیں ترکِ غفلت اور ترکِ معصیت ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

س: طبیعت کا اگر تزکیہ ہو جائے تو اس کا حاصل کیا ہے؟

ج: طبیعت کے تزکیے کے نتیجے میں تین بنیادی چیزیں حاصل ہوتی ہیں:

❶ اخلاص ❷ تقویٰ، اور ❸ محبت

اخلاص سے مراد ہے نیت، ارادے، شعور اور عمل سب میں اللہ کے حوالے سے یکسوئی، یعنی ہر کام کرتے وقت نیت یہ ہو کہ یہ اللہ کی خوشنودی کے لئے کرنا ہے اور پھر اسے کرتے ہوئے جن مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑے انہیں اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے انگیز کرنا اور سہہ جانا۔

تقویٰ بندگی کی سب سے اساسی حالت کا نام ہے اور یہ اللہ کے اس خوف سے پیدا ہوتا ہے جس کا مبنیٰ اور مبدء اللہ کی محبت ہے۔

محبت یہ ہے کہ ہر جذب وکشش پر اللہ کی کشش غالب آجائے۔

س: تقویٰ کے معنی عام طور پر بچنے اور پرہیزگاری کے کئے جاتے ہیں (یعنی اللہ کی معصیت سے بچنا اور منکرات سے پرہیز) لیکن آپ نے تو اس میں محبت کو بھی شامل کر دیا ہے؟

ج: تقویٰ کے معنی یقیناً معصیت سے بچنے اور منکرات سے پرہیز ہی کے ہیں لیکن یہ معانی ہمارے ذکر کردہ مفہوم سے متصادم نہیں ہیں۔ اسے یوں سمجھیے کہ تقویٰ دراصل فطرت کا وہ اولین داعیہ ہے جو شر سے بچنے اور خیر کی طرف لپکنے سے عبارت ہے۔ خیر کی طرف لپکنے کے لئے شر سے بچنا ہی فطرت سلیم کا بنیادی ڈھانچہ ہے اور ایمان ہو یا اعمال، دونوں کی قبولیت اسی پر منحصر ہے اور تمام فضائلِ دینی اگر کسی ایک فضیلت میں مشمول دیکھے جا سکتے ہیں تو وہ یہی تقویٰ ہے۔

اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تقویٰ کے مفہوم میں اللہ کا خوف اور اللہ کی محبت دونوں جمع ہیں تو یہ بات نقل اور عقل دونوں سے ثابت ہے۔ یہاں بظاہر خوف اور امید ایک دوسرے کی ضد لگتے ہیں لیکن حقیقتاً خوف سے امید کی تکمیل ہوتی ہے اور امید سے خوف کی اور وہ اصول جو ان کو ایک دوسرے کا تکمیلی عنصر بناتا ہے وہ تقویٰ ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایمان تقویٰ ہی کا نام ہے، وہی ایمان جسے رکھنے والے، قرآن کے مطابق، اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں (البقرہ ۲:۱۶۵) اس گفتگو سے تقویٰ اور محبت میں ظاہری غیریت کی تردید ہو گئی۔

عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر تقویٰ اس خوف کا نام ہے جو محبت سے مختلف ہے تو متقی کو خدا سے بھاگنا چاہیے درآں حالیکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تقویٰ جس قرب کا سبب ہے اس سے اوپر کسی تقرب کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تو گویا تقویٰ میں کارفرما خوف کوئی سادہ سا نفسیاتی خوف نہیں ہے بلکہ یہ اللہ جل جلالہٗ کے ساتھ بندے کے مثالی اور مکمل تعلق کی صحیح ماہیت

کا اظہار ہے یعنی یہ کہ اللہ کا خوف اس سے دوری پر نہ اکسائے اور اس کی محبت گستاخی اور شوخی کی طرف مائل نہ کرے۔ یہ مطلوب توازن اگر کسی چیز سے حاصل ہو سکتا ہے تو وہ یقیناً تقویٰ کے علاوہ کچھ اور نہیں۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے مومن کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ...... ﴾ (الزمر ۳۹:۹)

"جو رات کی گھڑیوں میں سجدے اور قیام کی حالت میں عاجزی کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔"

س: تزکیہ نفس کے عمل کا آغاز کہاں سے کرنا چاہیے؟

ج: طبیعت کے تزکیے یا دوسرے لفظوں میں اخلاق کے تزکیہ سے۔

س: طبیعت یا اخلاق سے کیا مراد ہے؟

ج: طبیعت انسان کی بنیادی ساخت کو کہتے ہیں جس سے اس کا شعور اور پورا مزاج تشکیل پاتا ہے گویا انسان کے سوچنے کا انداز اور اس کے ردعمل کا مخصوص طریقہ طبیعت ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ طبیعت کے میلانات اخلاق کہلاتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں طبیعت کا میلان جب واضح اور مستقل ہو جائے تو اسے اخلاق کہتے ہیں

س: اخلاق کی کچھ اور وضاحت کیجیے؟

ج: طبیعت میں موجود وہ صلاحیتیں جو فکر و عمل کی عکاسی کرتی ہیں انہیں اخلاق کہا جاتا ہے۔ مثال سے یوں سمجھیے کہ غصہ طبیعت کا ایک عنصر ہے یہی غصہ انسانی فکر و عمل کا ایک خاص رخ متعین کرتا ہے۔ یہ رخ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اخلاق اچھے

بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔ تزکیۂ نفس کا مقصود یہ ہے کہ اخلاق کی اچھائی کو ابھارا جائے اور برائی کو دبایا جائے۔

س: کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ تزکیۂ نفس کا اصل مقصود تزکیۂ اخلاق ہی ہے؟

ج: جی ہاں! بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ تزکیۂ نفس کا ہدف تزکیۂ اخلاق ہی ہے کیونکہ تمام انسانی فضائل اخلاق کے تزکیے سے مشروط ہیں۔

س: اس تزکیۂ مقصود کی طرف عملی پیش رفت کس طرح کی جا سکتی ہے؟

ج: اس کیلئے سب سے پہلے وہ مسلمہ فضیلت ڈھونڈی جاتی ہے جس کا حصول پورے انسانی وجود کی بہتری کا یقینی سبب ہو۔

س: یہ فضیلت کیوں کہ عام ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے پاس ایک محکم سند ہو جو ہمیں یہ بتائے کہ ہماری تخلیق کا مقصد ہی اس فضیلت کا حصول ہے۔

ج: اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاریات ۵۱:۵۶)

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی اور اطاعت کریں۔“

س: وہ فضیلت کیا ہے؟

ج: وہ فضیلت عبودیت یا بندگی ہے جو تمام فضائل کی لازمی بنیاد ہے۔ ہمارا وجود جن اجزاء سے عبارت ہے ان تمام اجزاء کو اس فضیلت کے حصول کی کوشش میں شریک ہونا چاہیے یعنی ہماری عقل، ہمارا نفس اور ہماری طبیعت سبھی کو بندگی کے رنگ میں رنگا ہوا ہونا چاہیے۔ یہ ہے تزکیۂ نفس کا اولین اور انتہائی داعیہ۔

س: اخلاق اور بندگی میں کیا تعلق ہے؟

ج: اخلاق اور بندگی میں بہت گہرا تعلق ہے کیونکہ جب تک بندگی ہماری طبیعت میں سرایت نہیں کرے گی اس وقت تک ہمارے بندہ ہونے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ کیونکہ آدھی بندگی حال ہے اور آدھی عمل، اور اخلاق ان دونوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

س: آپ کی اس بات سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اخلاق احوال بھی ہیں اور اعمال بھی؟

ج: یہ صحیح ہے، البتہ اولیت احوال کو حاصل ہے کیونکہ اعمال میں مطلوبہ بہتری احوال میں بہتری پیدا کیے بغیر ممکن نہیں۔

س: یہاں احوال سے کیا مراد ہے؟

ج: احوال کی آسان تعریف یہ ہے کہ طبیعت کچھ چیزوں سے مغلوب ہوکر اپنے اندر ایک ایسی فضا پیدا کر لیتی ہے کہ اس کا سارا نظام اس فضا کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس پوری صورتحال کو احوال کہتے ہیں یعنی طبیعت میں بندگی راسخ ہو جائے تو اس کا ہر میلان، ہر فعل اور تاثر بندگی کی کیفیت سے معمور ہو جاتا ہے، اسے طبیعت کا حال کہیں گے۔ اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ حال کسی چیز کا وہ ذاتی وصف ہے جس کی بنیاد پر اس کی کوئی تعریف متعین ہوتی ہے جیسے ٹھنڈا پانی اور گرم پانی۔ یہاں ٹھنڈک اور گرمی پانی کے دو مختلف احوال ہیں جنہوں نے ایک ہی چیز کی دو مختلف تعریفیں متعین کر دیں۔

س: یہاں تک تو سمجھ میں آ گیا کہ تزکیۂ اخلاق کا عمل تزکیۂ احوال سے شروع ہوتا ہے تاہم اس کی تفصیل ابھی باقی ہے کہ تزکیۂ احوال میں آغازِ کار کس حال سے کیا جانا چاہیے؟

ج: اس کا کوئی مستقل ضابطہ نہیں ہے۔ یہ بات ہر فرد کے حسب حال طے کی جاتی ہے۔
بنیادی اصول یہ ہے کہ بڑی رکاوٹ کو پہلے دور کیا جائے۔ وہ بڑی رکاوٹ ہر شخص
میں مختلف ہوسکتی ہے مثلاً کسی میں تکبر، کسی میں نفاق، کسی میں حسد وغیرہ۔

س: عام طور پر بڑی رکاوٹیں کون کون سی ہوتی ہیں؟

ج: جیسے نفاق، حبّ دنیا، تکبر، حبّ جاہ، عُجب، غضب، حسد، جُبن، کسل، بخل، حرص،
قساوت قلبی وغیرہ۔

باب دوم

امراضِ احوال (طبیعت) اوران کا علاج

- نفاق
- حب دنیا
- تکبر
- حب جاہ
- ریا
- عُجب
- غضب
- حسد
- بغض وکینہ
- جبن
- کسل
- بخل
- حرص وطمع
- قساوت قلبی
- شکم پروری
- جنس پرستی
- سخت مزاجی
- بے مروتی
- بیوی بچوں کے ساتھ سختی
- بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دینا
- رسوم ورواج کی بیجا پابندی
- کام چوری

نِفاق

حکم ربّانی

— ﴿یاایُّھاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْالِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالاتَفْعَلُوْنَ ۔ کَبُرَ مَقْتًاعِنْدَاللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالا تَفْعَلُوْنَ ۔﴾ (الصّف ۶۱:۲،۳)

مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

— ﴿اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تجدلھم نَصِیْرًا﴾ (النساء ۴:۱۴۵)

کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔

فرمانِ نبوی

— ''آیة المنافق ثلاث: اذا حدّث کذب، اذا أوتمن خان و اذا وعد اخلف ''(۱)۔

منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے اور امانت میں خیانت کرے۔

— ''قال رجل لحذیفةؓ: یااباعبداللّٰہ اماالنفاق؟ فقال: ان تتکلم بالاسلام ولاتعمل بہ۔'' (۲)

ایک آدمی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ نفاق کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ کہ تم زبان سے تو اسلامی تعلیمات کا اقرار کرو لیکن ان کے مطابق عمل نہ کرو۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق

۲۔ مسند الامام احمدؒ

س: نفاق کسے کہتے ہیں؟

ج: نفاق کی اصولی تعریف یہ ہے کہ دل اور زبان متفق نہ ہوں۔ اس کی دو بڑی قسمیں ہیں اعتقادی اور عملی۔ اعتقادی نفاق ایک قسم کا کفر ہے اور عملی نفاق، فسق۔ اعتقادی نفاق کی تعریف یہ ہے کہ آدمی ایمان کا اظہار تو کرے مگر دل میں ایسا انکار رکھے جو ارادتاً ہو، یا دوسرے لفظوں میں اقرار ظاہر کرنا اور انکار چھپانا۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿اِذَا جَآءَ کَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ، وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، اِنَّهُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾

(المنافقون ۶۳: ۱،۲)

''اے محمد! جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (از راہ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہیں اور خدا جانتا ہے کہ درحقیقت تم اس کے پیغمبر ہو لیکن خدا ظاہر کیے دیتا ہے کہ منافق (دل سے اعتقاد نہ رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور ان کے ذریعے سے (لوگوں کو) راہِ خدا سے روک رہے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ جو کام یہ کرتے ہیں برے ہیں۔

نفاق عملی یہ ہے کہ دین کے احکام کو ماننے کے باوجود ان پر دانستہ اور اختیاراً عمل نہ کیا جائے جیسا کہ قرآن حکیم نے سورہ الصّف میں ان لوگوں کی نکیر کی ہے جن کے قول و فعل میں تضاد ہو۔

واضح رہے کہ اعتقادی نفاق کفر کی بدترین قسم ہے اور عملی نفاق فسق کی جیسا کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، امانت میں خیانت کرتا اور وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ نیز فرمایا:

"لا الہ الا اللہ کلمة الف اللہ بها قلوب المسلمین۔ فمن قال واتبعها بالعمل الصالح فهو مومن ومن قالها واتبعها بالفجور فهو منافق"(۱)۔

یعنی لا الہ الا اللہ وہ کلمہ ہے جس سے اللہ نے مسلمانوں کے دلوں کو باندھ رکھا ہے پس جس نے یہ کلمہ پڑھا اور اس کے مطابق صالح اعمال کیے وہ مومن ہے اور جس نے یہ کلمہ پڑھا اور برے اعمال کیے وہ منافق ہے۔

س: نفاق کا ضرر کیا ہے؟

ج: نفاق کا سب سے بڑا ضرر تو اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کے نتیجے میں جہنم کی آگ کا عذاب ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے۔

س: اعتقادی نفاق کا علاج کیا ہے؟

ج: اعتقادی نفاق کا علاج ہمیں درکار نہیں ہے کیونکہ ایک مسلمان کو مسلمان رہتے ہوئے یہ مرض لاحق نہیں ہوتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اعتقادی نفاق کا حامل خود کو مریض نہیں سمجھتا اس لیے اس کو کوئی علاج بتانا بے سود اور بے معنی ہے۔ البتہ اس نفاق میں مبتلا کسی شخص کو خیر خواہی اور تبلیغ کی نیت سے بعض طریقوں سے سمجھانے اور حق کی طرف مائل کرنے کی کوشش ضرور کی جا سکتی ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ 'آداب تبلیغ' میں ہوگا۔

---

(۱) مسند الامام ربیع

س: عملی نفاق کا علاج کیا ہے؟

ج: عملی نفاق کی دو حالتیں ہیں۔ پہلی حالت تو یہ ہے کہ آدمی اس نفاق میں مبتلا ہو مگر کسی وجہ سے اس کے ضرر کو محسوس نہ کرتا ہو۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس کا شکار تو ہو لیکن اس سے رہائی پانے کی خواہش بھی رکھتا ہو۔

پہلی حالت عموماً دو وجوہ سے پیش آتی ہے۔ ایک غلط عقائد اور دوسرے حب دنیا، اس کا علاج اصولاً تصحیح عقائد سے شروع ہوگا۔ ایسے شخص کی وہ غلطی دریافت کرنی چاہیے جس کی وجہ سے وہ اپنے نفاق کے نقصانات کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو پا رہا۔ عام طور پر اس غلطی کے دو سبب ہوتے ہیں: ❶ اللہ کی رحمت کا غلط تصور اور ❷ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا غلط تصور۔ سب سے پہلے یہ باور کرنا اور کرانا چاہیے کہ اللہ کی رحمت اگر آخرت میں بھی نافرمانوں پر ایسی عام ہو کہ بڑے سے بڑا نافرمان بھی بخشا جائے تو اس کا سیدھا سادا مطلب تو یہ ہوا کہ، نعوذ باللہ، اللہ کے احکام محض مذاق تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان کے اس قدر خلاف ہے کہ خود یہ شخص بھی جو رحمت کا خود ساختہ تصور رکھتا ہے، اسے قبول نہیں کر سکتا۔ دوسرے سبب کا ازالہ بھی اسی نہج پر ہوگا کہ بلا قید اور عام شفاعت رسول کریم ﷺ کی عبدیت ہی نہیں بلکہ رسالت کے بھی منافی ہے کیونکہ اگر اس طرح کی شفاعت آپ ﷺ کو فرمانا تھی تو آپ ﷺ کا اپنی بندگی پر اصرار کوئی معنی نہیں رکھتا اور وہ پیغام بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو آپ ﷺ انسانوں کی اخروی نجات کے واحد ذریعے کے طور پر لے کر آئے۔ باقی رہی حب دنیا تو اس کی تعریف اور علاج نفاق کے بعد زیر بحث آئے گا۔

س: اس شخص کے لیے کیا علاج تجویز کیا جائے گا جو عملی نفاق میں مبتلا ہو، اس کے ضرر کو محسوس بھی کرتا ہو اور اس سے بچنا بھی چاہتا ہو؟

ج: اس معاملے میں علاج دراصل دو چیزوں کا ہوگا: ایک کسل اور دوسرے آخرت پر مطلوبہ یقین نہ ہونا۔ کسل کے علاج کا آغاز نماز باجماعت کی پابندی سے ہوگا اور رفتہ رفتہ دوسرے معاملات کا بھی احاطہ کرے گا۔ جماعت کی پابندی کسل کی دونوں قسموں یعنی ذہنی اور جسمانی کا علاج ہے۔

آخرت پر مطلوبہ یقین پیدا کرنے کی بہترین تدبیر تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے جن کے قول وفعل سے اللہ کا خوف جھلکتا ہو، تاہم اگر اس طرح کی صحبت میسر نہ ہو تو آخرت سے متعلق آیات قرآنیہ، احادیثِ نبویہ یا کوئی مستند بیان بار بار پڑھنے کی عادت ڈالی جائے۔ شروع میں اگر دل نہ لگے تو بھی یہ مطالعہ جاری رکھنا چاہیے۔ اس میں کچھ رسوخ پیدا ہو جائے تو پھر موت کو یاد رکھنے کی مشق کرنی چاہیے، یہ آخرت کے یقین کو بھی کامل کرتی ہے اور عمل کے محرکات کو بھی تقویت پہنچاتی ہے۔

❂❂❂❂❂

حبّ دُنیا

حکم ربّانی

— ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ (العنکبوت ۲۹:۶۴)

اور یہ دنیا کی زندگی تو کھیل تماشا ہے۔ آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ کاش وہ اس حقیقت کو جانتے!

— ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ (فاطر ۳۵:۵)

اے لوگو! بے شک اللہ کا وعدہ قیامت برحق ہے، لہذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دینے پائے۔

فرمان نبوی

— ’’ماالدنیافی الآخرۃ الامثل مایجعل احدکم اصبعه فی الیمّ، فلینظر بما یرجع؟‘‘(۱)

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنی انگلی سمندر میں ڈبوئے تو پھر دیکھو کہ وہ کتنا پانی اپنے ساتھ لاتی ہے۔؟‘‘

— ’’عن ابی ہریرہؓ قال: رأیت سبعین من اهل الصفة مامنهم رجل علیه رداء‘‘، امّاازار واماکساء‘‘ قدربطوافی اعناقهم فمنهامایبلغ نصف الساقین ومنها مایبلغ الکعبین، فیجمعه بیده کراهیه ان تری عورته‘‘(۲)

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا، باب فناء الدنیا

۲۔ صحیح بخاری، کتاب المساجد، باب نوم الرجال فی المسجد

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے ستر اہل صفہ کو دیکھا ان میں کسی کے پاس جسم کے اوپر کا حصہ چھپانے کے لیے چادر نہیں تھی، کسی کے پاس نچلا دھڑ ڈھانکنے کے لیے ازار (تہ بند، دھوتی یا پاجامہ وغیرہ) ہوتی یا چادر جسے وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے وہ کپڑا کسی کی نصف پنڈلی تک پہنچتا اور کسی کے ٹخنوں تک، پس وہ اسے اپنے ہاتھ سے اکٹھا کر رکھتے کہ کہیں ان کا قابل ستر حصہ عریاں نہ ہو جائے۔

س: حبِّ دنیا کیا ہے؟

ج: حبِّ دنیا یہ ہے کہ دنیا اس قدر مطلوب ہو جائے کہ آدمی اس کے حصول کا ہر ذریعہ، خواہ صحیح ہو یا غلط، اختیار کر لے اور اس بارے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی واضح ناراضی اور غضب کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا کی طلب اور محبت کا اللہ کی طلب اور محبت پر بداہۃً غالب آ جانا حبِّ دنیا ہے۔

س: حبِّ دنیا کا ضرر کیا ہے؟

ج: حبِّ دنیا نہ صرف یہ کہ تمام گناہوں کی جڑ ہے بلکہ اپنے شکار کو کفر، شرک اور جہنم تک پہنچا سکتی ہے جیسا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے متعدد ارشادات سے ثابت ہوتا ہے:

— ﴿ اِعْلَمُوْۤا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِیْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِؕ كَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَكُوْنُ حُطٰمًاؕ وَ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌؕ وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ ﴾ (الحدید ۵۷:۲۰)

”جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت (و آرائش) اور تمہارے آپس

میں فخر (وستائش) اور مال واولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب (وخواہش) ہے۔ (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش کہ (اس سے کھیتی اگتی اور) کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے۔ پھر وہ خوب زور پر آتی ہے۔ پھر (اے دیکھنے والے) تو اس کو دیکھتا ہے کہ یہ (پک کر) زرد پڑ جاتی ہے پھر چورا چورا ہوتی ہے۔ اور آخرت میں کافروں کے لیے) عذاب شدید اور (مومنوں کے لیے) خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو متاع فریب ہے۔

— ﴿ان الذین لایرجون لقاء ناورضوابالحیوۃ الدنیا واطمأنوا بھاوالذین ھم عن آیاتناغافلون ٥ اولئک ماواھم النار بما کانوا یکسبون۔﴾ (یونس۱۰:۷،۸)

''جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہو بیٹھے اور ہماری نشانیوں سے غافل ہو رہے ہیں'' ان کا ٹھکانا ان (اعمال) کے سبب جو وہ کرتے ہیں دوزخ ہے۔''

— ''مرّرسول اللّٰہ ﷺ بشأۃ میتۃ قد القاھااھلھا فقال والذی نفسی بیدہ للدنیا اھون علی اللّٰہ من ھذہ علی اھلھا۔''(۱)

''نبی کریم ﷺ ایک مری ہوئی بکری کے پاس سے گزرے جسے کوئی باہر پھینک گیا تھا اور اسے دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ کے نزدیک دنیا کی اتنی بھی اہمیت نہیں جتنی اس مری ہوئی بکری کی اس کے مالک کے نزدیک۔''

— ''الدنیاسجن المؤمن وجنۃ الکافر ''(۲)

۱۔ جامع الترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی ھوان الدنیاعلی اللّٰہ عزوجل

۲۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب الدنیا سجن المؤمن

"دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔"

س: حبِ دنیا کا علاج کیا ہے؟

ج: نفس انسانی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مطلوب کو باقی دیکھنا چاہتا ہے یعنی نفس کی طلب اور رغبت کا اصول یہ ہے کہ وہ اپنے مطلوب اور مرغوب سے علی الدوام واصل رہنا چاہتا ہے۔ اگر اس پر یہ بات عقلاً ہی نہیں تجربے اور مشاہدے سے بھی ثابت ہو جائے کہ یہ جس کی طلب میں سرگرداں ہے وہ خود بھی فانی ہے اور اس کو بھی فنا سے نہیں بچا سکتا تو اس صورت میں اس کی طلب و رغبت کا رخ بدل سکتا ہے۔ اور یہ اصول کہ نفس کا سب سے بڑا مطلوب بقا اور دوام راحت ہے، ایسا بدیہی امر ہے کہ کوئی شخص اس کی دلیل طلب کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ دوسری طرف یہ بھی اتنی ہی حتمی اور یقینی بات ہے کہ دنیا اور دنیا کی راحتیں خود اس کے طالب کے ساتھ فنا ہو جانے والی ہیں۔ اس تجربی صداقت کا استحضار اور اس ایمانی حقیقت کی یاددہانی کہ آخرت اور اس کی راحتیں نہ صرف یہ کہ خود باقی رہنے والی ہیں بلکہ اپنے طالب کی مطلوبہ بقا کا بھی سامان رکھتی ہیں، حبِ دنیا کی گرفت کمزور کرنے کی واحد اصولی تدبیر ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مرض اتنا گہرا اور پیچیدہ ہے کہ جب تک مریض خود اس سے نکلنے کی جان توڑ کوشش، جسے اصطلاح میں مجاہدہ کہتے ہیں، نہیں کرے گا، پورا افاقہ نہیں ہو سکتا۔ اس مجاہدے کے اجزاء یہ ہیں:

1. انفاق: جس کی شرعی تعریف یہ ہے کہ اپنی ضرورت سے زائد اللہ کی راہ میں خرچ کرو (البقرۃ ۲:۲۱۹)۔ شریعت نے "ضرورت" کے بے لچک حدود مقرر نہیں فرمائے ہیں۔ ہم معالجے کی مصلحت سے یہ تجویز کریں گے کہ بہت بنیادی ضروریات سے زیادہ مال و اسباب کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا انفاق کا وہ درجہ ہے جس کا پسندیدہ ہونا تو شرعاً بھی ثابت ہے، تاہم حبِ دنیا کے علاج کے لیے

اسے لازم سمجھنا چاہیے۔انفاق کے اس درجے پر ایک ضابطہ اور بھی محفوظ رکھنا چاہیے اور وہ یہ کہ ہر وہ زائد از ضرورت چیز فوری طور پر کسی مستحق کو دے دی جائے جس کی طرف نفس میں رغبت پائی جاتی ہو۔

❷ گھر میں دنیا کی باتیں نہ کرنا مثلاً اولاد سے اس طرح گفتگو کہ تمہیں ڈاکٹر بننا ہے یا انجینئر، مضر ہے بلکہ ان کے مستقبل پر اس طرح بات کرنی چاہیے کہ تمہیں ہر حال میں مسنون زندگی گزارنی ہے خواہ اس کا نتیجہ دنیاوی تنگی ہی کیوں نہ ہو۔اس طرح آدمی کا فوری ماحول کم از کم اتنا بہتر ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے لیے دنیا کی محبت کا محرک نہ بنے۔یہ ضابطہ رفتہ رفتہ دیگر تعلقات پر بھی عائد کرنا چاہیے۔

❸ موت کی یاد، قبر کا دھیان اور قبرستان میں عبرت کے حصول کے لیے آمد ورفت۔

❹ دوستوں کی خبر گیری اور ان کی محبت بڑھانے کی تدابیر سوچنا۔اس سے دو چیزیں میسر آئیں گی جو حبِّ دنیا کے علاج میں نہایت مفید ہیں۔ایک ایثار اور دوسرے انکسار۔رفتہ رفتہ خبر گیری کے اس دائرے کو وسعت دے کر عام مسلمانوں تک پہنچا دینا چاہیے۔

✿✿✿✿✿✿

تکبّر

حکم ربّانی

— ﴿وَلَاتَمْشِ فِیْ الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ (الاسراء ۱۷:۳۷)

اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔

— ﴿تِلْکَ الدَّارُ الْآخِرَۃُ نَجْعَلُھَالِلَّذِیْنَ لَایُرِیْدُوْنَ عُلُوًّافِیْ الْاَرْضِ وَلَافَسَادًاوَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔﴾ (القصص ۲۸:۸۳)

یہ آخرت کا گھر ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لئے ہے۔

فرمانِ نبوی

"الا اخبرکم باھل النار؟ کل عتلّ جوّاظٍ مُستکبرٍ" (۱)

کیا میں تمہیں جہنمیوں کی خبر نہ دوں؟ ہر سرکش، بخیل اور متکبر جہنمی ہے۔

— "قَالَ اللّٰہ عَزَّ وَجَلَّ :الْعِزُّإِزَارِیْ، وَالْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ، فَمَنْ یُنَازِعُنِیْ عَذَّبْتُہٗ۔" (۲)

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ عزت میرا پہناوا ہے اور بڑائی میری چادر ہے پس جو بھی ان میں سے کوئی ایک چیز بھی مجھ سے کھینچے گا میں اسے عذاب دوں گا۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر و صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، باب النار یدخلھا الجبارون

۲۔ صحیح مسلم، کتاب البرّ، باب تحریم الکبر

س: تکبر کیا ہے؟

ج: دوسروں کی تحقیر کرتے ہوئے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا تکبر ہے۔کسی واقعی خوبی اور فضیلت کی بنیاد پر اپنے کو بعض ایسے لوگوں سے بہتر سمجھنا جو وہی خوبی یا فضیلت یا تو سرے سے نہیں رکھتے یا مقابلتاً کم رکھتے ہیں، ممکن ہے کہ نامناسب تو ہو مگر تکبر نہیں ہے۔تکبر کا ایک لازمی جزو دوسروں کو حقارت سے دیکھنا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:''الکبر بطر الحق و غمط الناس ''(۱) یعنی تکبر یہ ہے کہ آدمی جانتے بوجھتے حق بات کو رد کرے اور لوگوں کی تحقیر کرے۔

تکبر کی دو قسمیں ہیں: ایک مطلق اور دوسرے جزوی۔ مطلق تکبر یہ ہے کہ آدمی اپنی واقعی یا فرضی خوبی کی نسبت اللہ کی طرف کیے بغیر دوسروں کو تحقیر کی نظر سے دیکھے۔ یہ تکبر شرک اور کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ جزوی تکبر میں آدمی اس خوبی کو اللہ کی دین سمجھتا ہے مگر اس کی روح سے بیگانہ ہو کر اسے دوسروں کی توہین و تحقیر کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ گویا تکبر کی ہر قسم میں دو چیزیں مشترک ہیں: خود کو بڑا جاننا اور دوسروں کی تحقیر، خواہ احساس میں ہو یا عمل میں۔

س: تکبر کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: ❶ اللہ کی رضا سے محرومی۔

﴿ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ ﴾ (النحل ۱۶:۲۳)

بے شک وہ (یعنی اللہ) تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

❷ جہنم میں ہمیشگی کا عذاب

﴿ قِیْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِیْنَ ﴾ (الزمر ۳۹:۷۲)

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ

”(اللہ کا) حکم ہوگا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ وہ کیا برا ٹھکانا ہے متکبر لوگوں کا۔“

نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ متکبر جہنم کا ایندھن بنیں گے اور یہ کہ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت سے محروم رہے گا۔(۱)

❸ لوگوں کی نفرت کا نشانہ بننا کیونکہ متکبر کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔

س: مطلق تکبر کا علاج کیا ہے؟

ج: آدمی کو مسلمان ہوتے ہوئے بھی تکبر کی یہ بدترین قسم پیش آسکتی ہے۔ایک مسلمان اس تکبر میں اس طرح مبتلا ہوتا ہے کہ اس کے اندر یہ احساس تقریباً غائب ہو جاتا ہے کہ اس کی حقیقی یا مزعومہ خوبیاں اللہ کی دین ہیں، تاہم عقلی طور پر وہ اس کا انکار نہیں کرتا۔مرض کی اس صورت میں مریض کو ایسے ماحول یا ایسے آدمیوں کی تفصیلی صحبت اختیار کرنے کا مشورہ دیا جائے گا جو ان امور میں، جن کی بنیاد پر تکبر پیدا ہوا ہے، اس سے بڑھے ہوئے ہوں، مثلاً ایک شخص اس بات پر تکبر میں مبتلا ہو کہ وہ بہت ذہین یا طاقتور ہے تو اسے ایسے اشخاص کے پاس بھیجا جائے گا جو اس سے کہیں زیادہ ذہین یا طاقتور ہوں۔اس طرح اس کا اپنے بارے میں یقین جو دعویٰ بن گیا ہے، متزلزل ہو جائے گا۔پہلے قدم پر یہی تزلزل درکار ہے۔اسی سے فائدہ اٹھا کر اسے یہ باور کرایا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا کوئی ذریعہ عطا نہیں فرمایا جس کی بنیاد پر ہم اپنی کامل فضیلت کا کوئی حتمی فیصلہ کرسکیں۔آگے کا معالجہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان دو اقدام کے بعد خود بخود ہوتا جائے گا۔

ایک بات ملحوظ رہے کہ بعض لوگوں میں جو یہ مشہور ہے کہ متکبر کا علاج یہ ہے کہ

(۱) مسند احمد بن حنبل، ج ۴ص ۳۰۶

اس کی تحقیر کی جائے تو یہ ہر صورت حال میں کارگر نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات تحقیر سے تکبر بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ ہاں! اس طرح کا علاج اس تکبر میں موثر ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے انکار تک جا پہنچا ہو۔ اس میں تحقیر ہی واحد راستہ ہے۔

س: گویا تکبر کے اکثر مظاہر سمجھانے بجھانے سے ٹھیک ہو جاتے ہیں؟

ج: دنیا میں ہر برائی سمجھانے سے ٹھیک ہو جاتی ہے لیکن سمجھانے کے بھی کئی مدارج ہوتے ہیں۔ تکبر میں جس طرح کا سمجھانا درکار ہے وہ یہ ہے کہ اونٹ کو پہاڑ تلے لے آیا جائے یعنی اسے ایک ٹھوس تقابل میں ڈال دیا جائے جس کے نتیجے میں اس کے پاس سوائے اعتراف کمتری کے کوئی اور راستہ نہ رہے۔ یہی تکبر کے تمام معالجوں کی بنیاد ہے۔

س: چونکہ تکبر ایک نہایت پیچیدہ مرض ہے اور اس کے عود کر آنے کے بھی امکانات رہتے ہیں۔ اس لیے کیا یہ ضروری نہیں کہ اس کے معالجے سے پیدا ہونے والی بہتری کو برقرار رکھنے کے لیے بھی کچھ تدابیر اختیار کی جائیں؟

ج: یقیناً کسی بھی معالجے کی کامیابی کی سطح برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے اور یہ مختلف تدابیر کا تقاضا کرتا ہے۔ تکبر کے علاج کی تاثیر کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لیے چار طرح کے اعمال کی پابندی مفید اور موثر ہے:

1. جماعت کی اس طرح پابندی کہ صف میں اپنے قریب والے نمازی سے بالکل جڑ کر کھڑے ہونے کی عادت ڈالی جائے۔
2. وہ قرآنی آیات جو اللہ تعالیٰ کے جلال و کبریائی کا اظہار کرتی ہیں انہیں تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان میں سے بعض کو اپنا ورد بنایا جائے۔
3. کثرت تسبیح و تحمید تاکہ علاج میں ایسا مبالغہ بھی نہ ہو جائے کہ آدمی اپنی واقعی خوبیوں

کا بھی منکر ہو جائے۔

❹ کثرت استغفار۔

س: محسوس ہوتا ہے کہ مطلق تکبر کے مذکورہ بالا علاج میں جزوی تکبر کا علاج بھی آ گیا ہے؟

ج: جی ہاں! جزوی تکبر کے ازالے کے لیے بھی وہی سب کچھ کرنا ہوگا جو اوپر بیان ہوا۔

س: کیا دوسروں کے مقابلے میں آگے بڑھنے کی خواہش و کوشش بھی تکبر میں داخل ہے؟

ج: جی نہیں! یہ تکبر نہیں ہے کیونکہ متکبر آدمی کسی چیز کی کوشش یا خواہش نہیں کرتا، اسے تو اپنے زعم میں ہر چیز حاصل ہوتی ہے۔سوال میں بیان کردہ صورت اگر اعتدال کے ساتھ ہو تو فطری ہے لیکن اگر اعتدال کے ساتھ نہ ہو تو حب جاہ کا پیش خیمہ ہے۔

س: اس کا مطلب یہ ہوا کہ حبّ جاہ تکبّر سے الگ ایک مرض ہے؟

ج: اصولاً تکبّر اور حبّ جاہ میں فرق ہے تاہم حبّ جاہ اپنی انتہاء کو پہنچ کر تکبّر میں ڈھل جاتی ہے۔

✿✿✿✿✿✿

حبّ جاہ

حکم ربّانی

— ﴿اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾

(الحدید:۵۷:۲۰)

جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا اور زینت (وآرائش) اور تمہارے آپس میں فخر (وستائش) اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب (وخواہش) ہے۔ (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش کی (اس سے کھیتی اگتی اور) کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے، پھر وہ خوب زور پر آتی ہے پھر (اے دیکھنے والے!) تو اس کو دیکھتا ہے کہ پک کر زرد پڑ جاتی ہے پھر چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں (کافروں کے لئے) عذاب شدید اور (مومنوں کے لئے) اللہ کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو متاع فریب ہے۔

— ﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ o كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ o ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ o كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ......﴾

تم کو کثرت (مال وجاہ) کی طلب نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبریں جا کر دیکھیں، دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، پھر دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، دیکھو اگر تم جانتے (یعنی) علم الیقین (رکھتے تو غفلت نہ کرتے) (التکاثر:۱۰۲:۱۔۵)

فرمانِ نبوی

—"ماذئبان جائعان ارسلا فی غنم بافسدلھامن حرص المرء علی المال والشرف لدینه"(۱)

دوبھوکے بھیڑیے جوبکریوں کے ریوڑ میں گھس جائیں اس کا اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا حبِ مال وجاہ انسان کے دین کا کرتے ہیں۔

—"عن ابی موسیٰؓ قال: دخلتُ علی النبی ﷺ اناورجلان من بنی عمی: فقال احدالرجلین، یارسول اللّٰہ !امرناعلی بعض ما ولاک اللّٰہ عزوجل؟وقال الآخرمثل ذلک، فقال:انا،واللّٰہ لانولی علی ھذاالعمل احداًساله، ولااحداًحرص علیه"(۲)۔

حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ سے ملنے گیا جب کہ میرے ساتھ میرے دورشتہ دار بھی تھے۔ان دونوں نے نبی اکرم سے درخواست کی کہ انہیں مناصب دیے جائیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ جومناصب کی حرص کرے اور ان کا مطالبہ کرے،ہم اسے یہ نہیں دیتے۔

س: حبِ جاہ اگرتکبر سے الگ ایک جداگانہ مرض ہے تو اس کی تعریف اور علاج کیا ہے؟

ج: حبِ جاہ کی پوری تعریف یہ ہے: بڑا بننے کی ایسی خواہش جو بندگی کی روح کے خلاف ہواور جائز و ناجائز کی تفریق مٹادے۔

حبِ جاہ کے علاج میں بڑی مدد ان امور سے بھی مل سکتی ہے جوتکبر اور حبِ جاہ کے لیے بتائے گئے ہیں۔ان کے علاوہ اس کے علاج میں دواصول مستقلاً ملحوظ رکھنے

۱۔جامع الترمذی،ابواب الزہد،باب ماذئبان جائعان ارسلافی غنم......

۲۔صحیح مسلم،کتاب الامارہ،باب النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیھا

چاہئیں: ایک ایثار اور دوسرے اخفائے صلاحیت۔ یہاں ایثار کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ایک چیز کا شرعاً اور قانوناً مستحق ہوتے ہوئے بھی اسے کسی دوسرے مستحق کے لیے چھوڑ دے اور اخفاء کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اپنی ان صلاحیتوں کو ایسے مواقع پر ظاہر نہ ہونے دے جہاں ان کے اظہار کے نتیجے میں کوئی مرتبہ ومنصب حاصل ہو سکتا ہو۔

س: حبّ جاہ کے بارے میں آپ نے جو کچھ کہا ہے اس میں دو باتیں وضاحت طلب ہیں۔ ایک تو آپ نے کہا ہے کہ دوسروں سے آگے بڑھنے کی خواہش اگر اعتدال کے ساتھ نہ ہو تو یہ حبّ جاہ کا پیش خیمہ ہے۔ یہاں اعتدال سے کیا مراد ہے؟ دوسرے یہ کہ آپ نے حبّ جاہ کی تعریف میں کہا ہے کہ یہ بڑا بننے کی وہ خواہش ہے جو بندگی کی روح کے خلاف ہو۔ ''بندگی کی روح کے خلاف'' ہونے کا کیا مطلب ہے؟

ج: آپ کی پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ حصول مقصود کا ذریعہ اور اس کے حصول کا استحقاق اگر شرعی جواز کے ساتھ ثابت ہوں اور ناکامی کی صورت میں بھی کامیاب ہونے والوں سے حسد یا بغض وغیرہ پیدا نہ ہو تو ہم کہیں گے کہ آگے بڑھنے کی خواہش میں اعتدال ملحوظ رہا ہے۔ اس صورت میں آگے بڑھنے کی خواہش فطری ہے اور اس سے کسی نقص وضرر کا احتمال نہیں ہوتا۔ ان چیزوں کا نہ ہونا البتہ اعتدال کے خلاف ہے اور حبّ جاہ پر دلالت کرتا ہے۔

جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ حبّ جاہ کی تعریف میں بڑا بننے کی خواہش کے ''خلاف بندگی'' ہونے کا کیا مطلب ہے تو اس کے دو پہلو ہیں: ایک تو یہ کہ طالب جاہ اللہ سے ایک مشروط تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً اس کی شکر گزاری اس وقت تک ہوتی ہے جب تک تمام معاملات اس کی خواہش کے مطابق چلتے رہیں، جوں ہی کوئی چیز خلاف مرضی ہوئی یہ شخص

شکایت اور شکوے تک پہنچ جاتا ہے یعنی اس کا رویہ تسلیم و رضا کے خلاف ہوتا ہے۔ دوسرا پہلو عملی ہے اور وہ یہ کہ طالب جاہ کی امیدیں اگر پوری نہ ہوں تو اس کی عبادات میں بھی خلل پڑ جاتا ہے۔ یہ حبّ جاہ کی ایسی یقینی نشانی ہے کہ اسے ایک کلیہ سمجھنا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ بندگی کے دو اہم اجزاء ہیں: ایک ہر حال میں راضی برضا رہنا، ذہنی طور پر بھی اور طبعی طور پر بھی، دوسرے اعمال عبودیت کو ان کے بتائے ہوئے معیار کے ساتھ انجام دینا۔ طلب جاہ اگر پوری نہ ہو تو یہ دونوں چیزیں لازماً متاثر ہوتی ہیں۔ آدمی جانتے بوجھتے اللہ کی رضا سے نا مطمئن ہو جاتا ہے اور اپنی امیدیں پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی عبادت بھی کسی نہ کسی پہلو سے متاثر ہوتی ہے۔

س: ایک آدمی کی امیدیں اگر پوری نہ ہوں اور اس پر بے اطمینانی اور مایوسی حملہ کرے اور اس کی عبادت بھی متاثر ہو لیکن وہ اللہ سے شکوہ کرنے کی بجائے یہ دعا مانگے کہ اے اللہ! مجھے اپنی رضا پہ راضی رہنے کی توفیق دے تو کیا یہ بھی حبّ جاہ کا شاخسانہ ہے؟

ج: یہ قابل اصلاح حالت تو ہے لیکن یہ حبّ جاہ نہیں ہے کیونکہ حبّ جاہ کا مریض اپنے عدم تسلیم و رضا کے ردعمل کو ٹھیک سمجھتا ہے جبکہ زیر نظر سوال میں آدمی شکایت یا بے اطمینانی کا احساس رکھنے کے باوجود ایک تو اس کے مقتضاء پر عمل نہیں کرتا اور دوسرے اس کی اصلاح کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا اسے مجموعی طور پر نفس کی کمزوری سے تو تعبیر کیا جائے گا لیکن حبّ جاہ کا نام نہیں دیا جائے گا۔

س: اس کیفیت کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا علاج یہ ہے کہ لمبی دعا مانگی جائے اور اس دعا کے بیشتر مضامین اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول اور آخرت کی بہتری سے متعلق ہوں۔ ان شاء اللہ اس پر مداومت سے اس کیفیت میں نمایاں بہتری کے آثار پیدا ہوں گے۔ اس کا تفصیلی

بیان اس جگہ آئے گا جہاں ہم تعلق باللہ کی مضبوطی کے ذرائع پر گفتگو کریں گے۔

س: حبّ جاہ کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: فسادِ دین بلکہ دین کا خاتمہ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دو بھوکے بھیڑیے ریوڑ کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا حبّ جاہ اور حبّ مال انسان کے دین کو نقصان پہنچاتے ہیں۔(۱)

حبّ جاہ کے نقصانات اور علاج کا تفصیلی بیان اس جگہ آئے گا جہاں ہم تعلق باللہ کی مضبوطی کے ذرائع پر گفتگو کریں گے۔

ا۔ سنن ترمذی، کتاب الزھد، باب ماذئبان جائعان ارسلا فی غنم۔

ریا

حکم ربانی

—﴿لَاتُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاالنَّاسِ﴾ (البقرہ۲:۲۶۴)

اپنے صدقے احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع مت کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھلاوے کے لئے خرچ کرتا ہے۔

—﴿يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَايَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (النساء۴/۱۴۲)

وہ لوگوں کے سامنے دکھلاوا کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔

فرمان نبوی

— ''من سمّع سمع اللّٰہ بہ ومن رأی رأی اللّٰہ بہ'' (۱)

جو شخص دکھلاوے کے لیے کوئی عمل کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت والے دن رسوا کردے گا اور جو کوئی نیک عمل لوگوں کی نظروں میں بڑا بننے کے لیے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے چھپے عیبوں کو لوگوں کے سامنے ظاہر کردے گا۔''

— ''من تعلّم علماًممایبتغی بہ وجہ اللّٰہ عزوجل لایتعلمہ الاّ لیصیب بہ عرضاًمن الدنیا، لم یجدعرف الجنة یوم القیامہ'' (۲)

جو شخص اس علم کو، جس کے ذریعے اللہ کی رضامندی حاصل کی جاتی ہے، اس لیے سیکھتا ہے کہ اس سے دنیا کا ساز وسامان حاصل کرے تو وہ قیامت والے دن جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔''

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الریاء والسمعہ

(۲) سنن ابی داوٗد، کتاب العلم، باب فی طلب العلم لغیر اللہ

س: ریا کیا ہے؟

ج: عبادات میں معبود سے بالکل غافل ہو کر یا عبادات کے حقیقی مقاصد (اخلاص وغیرہ) کو نظر انداز کر کے مخلوق کی نگاہ میں اچھا اور بڑا بننے کی کوشش کرنا ریا کہلاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عبادت کے دوسرے سرے پر جہاں معبود کو ہونا چاہیے وہاں مخلوق کو براجمان کر لینا ریا ہے۔

ریا کو حدیث شریف میں شرک اصغر فرمایا گیا ہے[1] اور سنن ابن ماجہ میں ہے "ان یسیر الریاء شرک"[2] یعنی تھوڑا ریا بھی شرک ہے اور اگر غور کریں تو بلاشبہ شرک کے ساتھ جتنی مماثلت ریا اور تکبر کو ہے وہ کسی اور خرابی کو نہیں۔ تکبر میں ایک طرح سے معبود کا انکار پوشیدہ ہوتا ہے جبکہ ریا میں بندگی کا انکار کارفرما ہوتا ہے کیونکہ متکبر آدمی اللہ تعالیٰ کی بڑائی سے بے خبر ہوتا ہے اور ریاکار بندگی کے تقاضے سے۔

س: ریا کی عملی پہچان کیا ہے؟

تمام ریاکاروں میں ایک چیز لازماً مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان کی تمام عبادات اور اعمال حسنہ ہمیشہ جلوت میں ہوتے ہیں۔ ان کی خلوت یا تو اللہ کی یاد اور نیکی کے منصوبوں سے خالی ہوتی ہے یا پھر ان کی مجلسی زندگی کے مقابلے میں ان کی تنہائی کی عبادات وغیرہ نہایت کم اور غائب دماغی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس بات میں ہرگز کوئی استثنیٰ نہیں کہ ریاکار کی عبادات کی مقدار اور معیار دونوں اس کی تنہائی میں آ کر نہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً دیکھنے والے موجود ہوں تو یہ شخص عبادات واذکار کثرت وسہولت اور ذوق وشوق کے ساتھ کر سکتا ہے لیکن جہاں کوئی دیکھنے والا

(۱) مسند احمد بن حنبل، ج۵ ص ۴۲۸، ۴۲۹

(۲) سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب من ترجی له السلامة من الفتن

ج: نہ ہو وہاں اس کے لیے دو رکعتیں بھی دوبھر ہو جاتی ہیں اور اللہ کے لیے کئے جانے والے تمام اعمال غفلت اور کسل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تاہم ریا اگر ثابت بھی ہو جائے تو جتنے اعمال لوگوں کے سامنے کرنے کی عادت پڑ چکی ہو اس میں کمی نہیں کرنی چاہیے بلکہ سارا زور خلوت کی بہتری پر دینا چاہیے۔اس کی تفصیل ان شاء اللہ علاج میں آجائے گی۔

س: بعض لوگ اچھی صحبت میں عبادات وغیرہ میں مستعد ہو جاتے ہیں لیکن تنہائی میں یا اس ماحول سے باہر کسل اور غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں کیا یہ ریا ہے؟ اسی طرح دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ مجمع میں بیٹھے تسبیح پر ذکر کرتے رہتے ہیں کیا اسے بھی ریا کہا جائے گا؟

ج: ریا کا جزولازم دوسروں کی نظر میں اچھا اور بڑا بننا ہے یا یوں کہہ لیں کہ ریا کار کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ یا تو لوگ اسے اپنے سے اچھا سمجھیں یا اس کے نقائص کی طرف ان کی نگاہ نہ جانے پائے۔بعض اوقات ایک ایسا آدمی جو تنہائی میں کسل اور غفلت کا شکار رہتا ہے لیکن اچھی صحبت میں آنے پر اس کی غفلت اور کسل کم یا ختم ہو جاتی ہے، یہ ریا نہیں ہے۔ یہ صحبت کا اثر ہے یا اس آدمی کے اندر پیدا ہونے والی شرمندگی کا نتیجہ ہے۔اسی طرح بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ مجلس وغیرہ میں بیٹھے تسبیح پھیرتے رہتے ہیں۔اگر یہ عمل تنہائی میں بھی برقرار رہتا ہے تو اسے ریا نہیں کہا جائے گا۔مطلب یہ کہ کسی خاص طرح کی مجلس یا مخصوص آدمی کے سامنے اعمال میں مقدار یا معیار کے لحاظ سے بہتری پیدا ہو جانا فطری ہے۔ ہاں! اگر یہ ہو کہ جو شخص اپنے استاد یا اچھے لوگوں کی صحبت میں عبادات کی طرف خوب راغب اور کاربند رہتا ہے، اگر اس کی یہ رغبت اور مستعدی تمام لوگوں کے سامنے اسی طرح

رہتی ہے مگر تنہائی اس کے برعکس ہوتی ہے تو پھر یہ ریا ہے۔ ریا میں دراصل مجموعی جلوت اور مجموعی خلوت کا تضاد کارفرما ہوتا ہے۔ یہ تضاد اگر عقیدے میں ہو تو نفاق ہے عمل میں ہو تو ریا ہے لیکن کسی خاص مجلس اور مجموعی تنہائی کا تضاد یا اختلاف ضروری نہیں کہ لازماً ریا ہی ہو مثلاً ایک شخص نیک لوگوں کی معیت میں رہتا ہے تو تہجد گزار بھی ہو جاتا ہے لیکن تنہائی میں اسے جماعت ہی کے لالے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ریا نہیں ہے۔ دوسری طرف ایک اور آدمی ہے جس کی تنہائی کا حال پہلے شخص جیسا ہی ہے لیکن وہ دنیا داروں کے کسی خاص حلقے میں جا کر پرہیز گار بن جاتا ہے تو یہ ریا ہے۔

س: ریا کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: ❶ ریا درحقیقت ایمان کی نفی اور شیطانی چکمہ ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا﴾ (النساء۴:۳۸)

''یعنی جو لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں، وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان جس کا ساتھی ہو تو وہ بہت برا ساتھی ہے۔''

❷ ریا چونکہ ایک طرح کا شرک ہے لہذا جس طرح شرک سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں (اور ان کا کوئی اجر نہیں ملے گا) اسی طرح ریا سے بھی اعمال ضائع ہو جاتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ:

''الرياء يحبط العمل كما يحبطه الشرك''(۱)

''یعنی ریاء سے اسی طرح اعمال ضائع ہو جاتے ہیں جس طرح شرک سے۔''

(۱) مسند امام ابی ربیع

❸ ریاء کا نتیجہ جہنم ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک طویل روایت میں ہے کہ قیامت کے دن ایک مجاہد، ایک عالم دین اور ایک سخی کو اللہ کے دربار میں پیش کیا جائے گا اور جب وہ اللہ کے حضور تسلیم کریں گے کہ ان کے پیش نظر محض اللہ کی خوشنودی نہ تھی بلکہ ریا اور دنیوی مفاد بھی تھا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ وہ تو تمہیں دنیا میں مل چکا اور میں ان اعمال کو قبول نہیں کرتا جو خالص میرے لیے نہ ہوں لہذا فرشتوں کو حکم ہوگا کہ انہیں گھسیٹتے ہوئے جہنم میں لے جاؤ۔(۱)

س: ریا کا علاج کیا ہے؟

ج: ریا کا علاج ملامت ہے یعنی اچھا سمجھنے والوں کے سامنے اپنے واقعی نقائص کا شدت کے ساتھ اظہار۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو کچھ لوگ بہت اچھا سمجھتے ہوں درآں حالیکہ اس کی اصلیت اس کے برعکس ہو یا کم از کم وہ اتنا اچھا سمجھے جانے کا مستحق نہ ہو تو ایسے آدمی کو چاہیے کہ ان لوگوں کو اس طرح اپنے نقائص کی خبر دے کہ انہیں یہ احساس ہو کہ جیسے یہ آدمی ان سے مشورے اور اصلاح کا طالب ہے۔ یہ وہ حقیقی ملامت ہے جو اکثر اوقات شرعاً بھی واجب ہوتی ہے۔

اس کا دوسرا علاج تنہائی میں لمبی نماز پڑھنا ہے تاہم اس دوران میں جتنے اعمال یہ شخص مجمع میں کرتا ہے اگر وہ عبادات کے زمرے کے ہوں تو اسے چاہیے کہ انہیں نہ چھوڑے۔ یہاں ایک بات سمجھنا ضروری ہے کہ اکثر اوقات ایک مائل بہ ریا شخص نوافل کو بھی خوب ظاہر کر کے پڑھتا ہے جب کہ یہ بھی سنت سے معلوم ہے کہ نفلی عبادات کی فضیلت تنہائی میں زیادہ ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے:

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب من قاتل للریاء

"صلّوا ایھا الناس فی بیوتکم ، فانّ افضل صلاۃ المرء فی بیتہ الّا المکتوبۃ"(۱)

"یعنی اے لوگو! نماز گھروں میں پڑھا کرو کیونکہ فرض نمازوں کو چھوڑ کر آدمی کی بہترین نماز وہی ہے جو وہ اپنے گھر میں پڑھے۔"

تاہم اس صورت میں بھی اس شخص کو اولاً یہی کہا جائے گا کہ تم جو نفل لوگوں کے سامنے پڑھتے ہو انہیں ویسے ہی جاری رکھو البتہ کم از کم اتنی ہی عبادت تنہائی میں بھی کرنے کی کوشش کرو۔ جب یہ بات حاصل ہو جائے تب اس سے کہا جائے گا کہ اب ان سنتوں پر عمل کرو جو نفل عبادات کے بارے میں ہیں کیونکہ تزکیے کا اصول یہ ہے کہ فسق کے خاتمے کے لیے فضائل کو سند نہیں بنایا جاتا بلکہ واجبات پر چلا جاتا ہے جب فسق کا ازالہ ہو جائے تب فضائل کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

س: ہمارے معاشرے میں ریا کے عمومی مظاہر کیا ہیں؟

ج: ریا کی دو قسمیں ہیں: دینی معنی میں اچھا کہلانے کی خواہش اور دنیوی معنوں میں اچھا کہلانے کی خواہش۔ عام طور پر دینی حلقے کے لوگ خود کو متقی اور صاحب حال ظاہر کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں جبکہ دنیادار عمومی اخلاقی معیارات پر داد و تحسین کے خواہاں ہوتے ہیں جیسے سخاوت و فیاضی میں۔

س: بعض لوگ اپنی خامیوں کا برملا اقرار کرنا عادت بنا لیتے ہیں کیا یہ چیز بھی ریا سے متعلق ہے؟

ج: جی ہاں! اپنی خامیوں کا ڈھونڈورا پیٹنا بھی ریا ہے کیونکہ ہمارے اجتماعی لاشعور میں اپنی خرابیوں کا اظہار کرنے والے کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب صلاۃ اللیل

س: اختلاف رائے کا کوئی تعلق ریا سے ہے؟

ج: کسی دینی دلیل پر کسی بڑے آدمی سے اختلاف ہو تو اس اختلاف کو محض اس لیے چھپانا کہ میری مقبولیت کم ہو جائے گی یا اپنی مقبولیت بڑھانے کے لیے کسی بڑے آدمی سے ایسا اختلاف کرنا جو شرعاً کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا ہو، یہ سب ریا ہی کے مظاہر ہیں۔

س: اگر آدمی کو اپنی خواہش و کوشش کے بغیر لوگوں کو اس کے بعض اعمال حسنہ کا پتہ چل جائے اور وہ اس کی تعریف کریں تو کیا اسے بھی ریا میں داخل سمجھا جائے گا؟

ج: نہیں۔ یہ ریا نہیں ہے جیسا کہ حدیث میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: ''**أرأيت الرجل يعمل العمل من الخير ويحمده الناس عليه**'' یعنی اگر کوئی آدمی نیک عمل کرے اور لوگ اس کی تعریف کریں تو اس کا کیا حکم ہے؟ (یعنی کیا یہ ریا ہے؟) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**تلك عاجل بشرى المومن**''[1] (نہیں) یہ تو مومن کے لیے دنیا ہی میں خوشخبری ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر، باب اذا اثنی علی الصالح

عُجب

حکم ربّانی

—﴿فَلَاتُزَكُّوْااَنْفُسَكُمْ هُوَاَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی﴾ (النجم:۵۳:۳۲)

''اپنے آپ کو نیک نہ ظاہر کرو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون پرہیزگار ہے۔(۳۲)

—﴿وَلَاتُصَعِّرْخَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَاتَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔﴾ (لقمان:۳۱:۱۸)

اور لوگوں سے بے رخی نہ کر۔زمین پر اکڑ کر نہ چل۔بے شک! اللہ کسی اکڑنے والے اور غرور کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔(۱۸)

فرمان نبوی

—''اذاقال الرجل''هلک الناس فهواهلکهم''— قال مالک ذلک بتحزناًلمايری فی الناس فلااری به باساً،واذاقال ذلک عجباً بنفسهٖ وتصاغراًللناس فهوالمکروه الذی نهی عنه۔''(۱)

جب کوئی کہے کہ لوگ ہلاک ہوگئے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہلاک ہوگا۔(امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی لوگوں میں دینی کمزوریاں دیکھ کر یہ جملہ کہے تو روا ہے لیکن اگر کوئی اعجاب نفس سے لوگوں کو حقیر سمجھتے ہوئے یہ تبصرہ کرے تو اسی چیز سے منع کیا گیا ہے)۔

—''بينمارجل يمشی فی حلة تعجبه نفسه ،مرجل جمته ،اذخسف اللّٰه به فهو يجلجل إلی يوم القيامة(۲)۔

ایک شخص عمدہ لباس پہنے ،بودے جمائے اکڑتا اتراتا چلا جارہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یکایک اسے زمین میں دھنسادیا جہاں وہ قیامت تک اسی طرح زمین میں دھنستا رہے گا۔

(۱)سنن ابی داؤد،کتاب الادب،باب ۷۷

(۲) صحیح بخاری،کتاب اللباس،باب من جرّثوبه من الخيلاء

س: عُجب کی تعریف کیا ہے؟

ج: آدمی کا اپنی کسی خوبی اور کمال کو یا تو اپنی طرف سے سمجھنا اور اللہ کی عطا کو ذہناً اور حالاً فراموش کر دینا یا اپنے آپ کو اس کا مستحق جاننا اور نتیجتاً اللہ کے فضل پر شکر گزار اور خوش ہونے کی بجائے اپنی انفرادیت و امتیاز پر شاداں ہونا یہ عُجب کی مفصل تعریف ہے جس میں اس کے بڑے بڑے اجزاء آ گئے ہیں۔ اور مختصراً یہ کہ کمال کو اپنی طرف سے سمجھنا اور اس پر اکڑنا اور یہ بھول جانا کہ یہ اللہ کی عطا ہے جو وہ سلب بھی کر سکتا ہے۔

س: عُجب کی مفصل تعریف میں کئی باتیں آ گئی ہیں جو اجمال کی وجہ سے واضح نہیں ہوئیں بہتر ہوگا کہ ایک ایک جزو کی ضروری تشریح کر دی جائے؟

ج: عُجب کا پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے کمال کے حصول کی نسبت بھی اپنی طرف کرے اور استحقاق کی نسبت بھی۔ پہلے جزو کے نتیجے میں اللہ کے فضل کا تصور غائب ہو جاتا ہے اور دوسرے کے نتیجے میں اللہ کے فضل کا ایک ذہنی خیال تو رہتا ہے مگر اس کی شکر گزاری پیدا نہیں ہوتی۔ گویا کسی واقعی یا خیالی وصف کی بناء پر اللہ کی نعمت کا استحضار اور اس پر اس کی شکر گزاری اگر اپنی مطلوبہ سطح پر ذہن اور طبیعت دونوں میں راسخ نہ ہو اور ساتھ ہی یہ عقیدہ کہ اللہ دیتا ہے اور دے کر واپس بھی لے سکتا ہے زندہ حالت میں موجود نہ ہو تو اس سے آدمی کے اپنے منفرد اور ممتاز ہونے کا احساس ناروا حد تک قوی ہو جاتا ہے۔

عُجب کے دوسرے درجے میں آدمی کمال و خوبی کی نسبت تو اپنی طرف نہیں کرتا لیکن خیال یا احساس کی سطح پر اس کمال و خوبی کو اپنا حق ضرور جانتا ہے یعنی اگر وہ کمال اسے نہ ملتا تو گویا یہ اس کی حق تلفی ہوتی۔ ایسا آدمی اللہ کو منعم تو مانتا ہے لیکن اس کے شکر کا ضروری حق ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

عُجب کا ایک اور درجہ بھی ہے جس کے الگ سے کوئی معنی نہیں ہیں بلکہ وہ مذکورہ بالا دونوں درجات ہی سے تعلق رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کا ذہن تو یہ مانتا ہو کہ میرے پاس جو کچھ ہے اللہ ہی کا دیا ہوا ہے مگر از روئے حال وہ اپنے اس تصور کے برعکس جذبات واحساسات رکھتا ہو۔ ایسے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اس دعوے کی لہر میں رہتا ہے کہ اللہ نے فلاں معاملے میں میری طرح کسی اور کو نہیں بنایا۔ یہ عُجب کی پیچیدہ ترین اور نہایت خطرناک قسم ہے کیونکہ اس کا مریض اس دھوکے میں مبتلا رہتا ہے کہ میں تو تحدیث نعمت کر رہا ہوں۔

عُجب عوام کی بیماری نہیں ہے اس میں زیادہ تر خواص ہی مبتلا ہوتے ہیں۔ ہم نے جو تیسری قسم بتائی ہے اس میں زیادہ تر دیندار حضرات گرفتار ہوتے ہیں یعنی علماء اور صوفیاء وغیرہ۔ اس موضوع پر اگر کسی کو پوری تفصیل درکار ہو تو وہ ابن جوزی کی ''تلبیس ابلیس'' کا مطالعہ کرے۔

س: عُجب پر آپ کی گفتگو قدرے طویل ہو گئی اس لیے ذہن تمام نکات کا احاطہ نہیں کر پا رہا۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ عُجب کے بڑے بڑے مظاہر اور نقصانات نمبر وار بیان کر دیں؟

ج: جی ہاں! عُجب کے بڑے بڑے مظاہر یہ ہیں:

1. اپنے آپ کو کسی ایک یا چند معاملات میں دوسروں سے ممتاز جاننا۔ یہ چیز تکبر میں بھی پائی جاتی ہے لیکن تکبر میں صرف اپنا اقرار ہوتا ہے اور دوسرے کو اس بڑائی سے محروم سمجھا جاتا ہے جب کہ عُجب میں وہ خوبی دوسروں میں بھی تسلیم کی جاتی ہے لیکن خود سے کم۔
2. دوسروں کی تعریف اس طرح کرنا جیسے کوئی استاد اپنے شاگرد کی یا کوئی بڑا اپنے چھوٹے کی کرتا ہے اور اس تعریف پر طالب داد ہونا۔

3. اپنے کمال کو مبالغے کے ساتھ محسوس اور ظاہر کرنا۔

4. اپنی خوبیوں میں ایسا انہماک رکھنا کہ گویا یہ اللہ کی دین نہیں ہیں بلکہ اپنے زور بازو سے حاصل کی گئی ہیں۔

5. اپنے کمالات پر اللہ کا شکر گزار نہ ہونا اور اگر ہونا بھی تو تکلفاً۔

6. عُجب میں مبتلا آدمی کی ایک عام پہچان یہ ہے کہ اس کی گفتگو میں اس طرح کے ٹکڑے ضرور ہوتے ہیں ''لیکن میرا تو یہ خیال ہے''، ''میں یہ نہیں سمجھتا کہ فلاں کے اس قول کو کوئی اہمیت دی جا سکتی ہے''، ''میں آپ کو بتاتا ہوں''، ''میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں''، ''آپ نے بات تو اچھی کہی ہے لیکن میں اسے ذرا اور اوپر لے جاتا ہوں'' وغیرہ وغیرہ۔

7. متکبر آدمی کے برعکس عُجب میں مبتلا شخص بہت دھیما، خوش اخلاق اور بعض اوقات متواضع بھی ہوتا ہے۔ اگر اوپر کی علامتیں اس طرح کے رویے رکھنے والے کسی شخص میں پائی جائیں تو اس پر عُجب کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

8. ایسا شخص اپنے موجودہ کمال اور خوبی میں اضافے کی ضرورت نہیں سمجھتا اور اس کی ترقی کے لیے درکار کوشش اور محنت نہیں کرتا۔ یہ ایک عام نشانی ہے۔

س: عُجب کے چند بڑے نقصانات کیا ہیں؟

ج: عُجب کے چند نقصانات درج ذیل ہیں:

1. وہ احساسِ محتاجی اور خوف بے نیازی جو بندگی کا خاصا ہے، عُجب کی وجہ سے غائب ہو جاتا ہے یعنی بندہ اپنے آپ کو اللہ کا محتاج نہیں محسوس کرتا اور اس کی نعمتوں کے سلب ہو جانے کے امکان سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔

2. عدمِ شکر

3. انکسار، جو مسلمانوں کی معاشرت کی ایک بڑی قدر ہے، کا فقدان۔

4. نفاق یعنی زبان یا ذہن سے اللہ کی نعمت کا اس طرح اقرار کرنا کہ دل اس کی تصدیق نہ کرے۔ یہ عُجب کا لازمی نقصان ہے۔

5. آگے بڑھنے یا کسی سے کچھ سیکھنے کی صلاحیت کا کم ہو جانا یا بالکل ہی نہ رہنا۔

س: عُجب کا علاج کیا ہے؟

ج: عُجب کے علاج میں کچھ صورتیں تو وہی تجویز اور اختیار کی جائیں گی جو تکبر اور حبِّ جاہ کے علاج میں بیان ہوئی ہیں۔ باقی اصولاً عُجب کا علاج ہے اپنی محتاجی پر دلائل قائم کرنا اور اس محتاجی کو مسلسل یاددہانی کے ذریعے طبیعت میں ایک مستقل احساس کے طور پر اتارنے کی کوشش کرنا اور شکر میں شدت (یعنی مجھ پر اللہ کا بڑا انعام ہے لیکن میں اس بات سے بے فکر نہیں ہوں کہ اللہ اپنا انعام واپس بھی لے سکتا ہے لہذا اللہ کی خوشنودی کے لیے میری زبان کو اس کے شکر سے تر اور دل کو اس کی ثناء سے معمور رہنا چاہیے)۔ یہ ہے عُجب کا اصولی علاج۔

س: عُجب کے علاج کی عملی صورتیں کیا ہیں؟

ج: 1 دن میں دو رکعتیں عُجب کے ازالے کی نیت سے پڑھنا اور بس اسی دعا کی تکرار رکھنا کہ ''یا اللہ! میں اپنے اندر یہ مرض پاتا ہوں۔ اس کا فوری ازالہ فرما دیجیے اور آئندہ کے لیے مجھے اس سے اور دیگر رذائل نفس سے محفوظ رہنے کی توفیق عنایت فرما دیجیے۔'' یہ تدبیر ہر گناہ کے لیے فرداً فرداً اور تمام گناہوں کے لیے مجموعاً اختیار کی جا سکتی ہے بلکہ کی جانی چاہیے، چاہے کسی گناہ کا استحضار ہو یا نہ ہو۔

2 درود ابراہیمی کثرت سے پڑھنا اور اس میں حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسماء مبارکہ سے پہلے سیدنا کا اضافہ کرنا۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا کے اضافے کو مستحب فرمایا ہے۔ یہاں جس مقصد کے لیے ہم یہ درود تجویز کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس لفظ کی ایک معالجاتی افادیت بھی ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی بڑائی

چونکہ مخلوق کی بڑائی ہے لہذا اس کا استحضار اور اقرار نفس میں شکستگی پیدا کرتا ہے۔ درود شریف کی ایک حکمت مستقل محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ کہ رسول اکرم ﷺ کی جو عقیدت، محبت اور اطاعت شرعاً مطلوب ہے، اسے کثرت سے ذہن اور عمل میں ایک بڑے دینی مقصد کے طور پر ملحوظ رکھنا نفس کی ان تمام بیماریوں کے علاج میں انتہائی کارگر اور موثر ہے جن کے اندر دعوے کا کوئی رنگ پایا جاتا ہے مثلاً تکبر، بُغض، کینہ، عُجب اور کثرت مال و اولاد پر تفاخر وغیرہ کیونکہ اللہ کے آگے عاجزی اختیار کرنے سے نفس کو نفسیاتی طور پر اس ذلت کا سامنا نہیں ہوتا جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے عاجزی اختیار کرنے سے ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ عبودیت کسی بھی درجے میں رسول اللہ ﷺ کی غیر مشروط اتباع اور مطلق اطاعت کے بغیر عنداللہ مقبول نہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

(النساء ۴:۶۵)

"پس اے نبی ! تمہارے رب کی قسم! ایسے لوگ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام باہمی جھگڑوں میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو فیصلہ تم کرو اس پر وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ دل و جان سے اسے تسلیم کر لیں۔"

❸ اسلاف خصوصاً صحابہ کے سوانح اور کارنامے پڑھنا۔

❹ اگر مریض عالم بھی ہو تو بھی کسی بڑے عالم سے قرآن مجید سبقاً سبقاً پڑھنے کا آغاز کرنا۔ اس میں بظاہر دو بڑی حکمتیں ہیں ایک عام اور دوسری خاص۔ عام حکمت یہ ہے کہ نفس کا کوئی نقص اور کوئی بیماری ایسی ہو ہی نہیں سکتی جس کا مکمل اور حتمی علاج قرآن فراہم نہ کرتا ہو، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي

الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس:۱۰:۵۷)

"اے لوگو! تمہارے پاس رب کی طرف سے ایک نصیحت آئی ہے۔ وہ تمام قلبی بیماریوں سے شفا بخشنے والی اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔"

خاص حکمت یہ ہے کہ قرآن خود اپنے متعلق جس علم کے حصول کا مطالبہ کرتا ہے اس میں کمال کا حصول ممکن ہی نہیں ہے یعنی کوئی بڑے سے بڑا عالم یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ قرآن کے ضروری علوم اور حقائق پر مکمل طور سے حاوی ہو چکا ہے۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ علم کی کسی بھی سطح پر قرآن کی محتاجی کم نہیں ہوتی اور قرآن پر غور کرنے کی ضرورت ماند نہیں پڑتی۔ جب کوئی ایسا شخص جو قانونی معنی میں کتاب اللہ کا واجبی علم رکھتا ہوا اپنے کسی نقص کے ازالے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس رجوع کرنے کے طریقے میں مصلحتاً کسی ایسی چیز کا اضافہ کیا جاسکتا ہے جو شرعاً بھی مستحب ہو اور نفس میں تواضع پیدا کرنے کا سبب بھی ہو مثلاً ہماری رائے میں یہاں کسی عالم سے قرآن شریف کو سبقاً سبقاً پڑھنا اس مصلحت کو کافی حد تک پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں یہ اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی عالم ہوتے ہوئے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھنے کے لیے ایسا کون سا جواز پیدا کرسکتا ہے جو اس کی نظر میں تکلف نہ ہو بلکہ ایک واقعی ضرورت ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہ عالم ہے تو یہ بات زیادہ سمجھتا ہوگا کہ قرآنی علم کے لیے درکار کون کون سی چیزیں فی الوقت اسے حاصل نہیں مثلاً بعثت رسول اللہ ﷺ سے پہلے کی تاریخ و ادب، قرآن کی فصاحت و بلاغت، علمِ احکام، اسبابِ نزول وغیرہ۔

اس تجویز سے ان شاء اللہ دو بڑی چیزیں حاصل ہو جائیں گی۔ ایک تو قرآن کا مزید علم اور دوسرے عالم ہونے کے باوجود کسی کی شاگردی اختیار کرنا اس کے نفس پر بار ہو گا۔ اس بار کو وہ اللہ کی خوشنودی اور اپنی اصلاح کے لیے اٹھائے گا تو اس کے مطلوبہ نتائج جلدی اور عمدگی کے ساتھ ظاہر ہونے کی پوری امید ہے۔

5. کوئی مفید علم اور فن سیکھنا خواہ وہ دنیاوی ہی کیوں نہ ہو۔

6. اپنی جس خوبی پر فخر ہو اس خوبی میں کمال پیدا کرنے کے لیے کسی کی مدد اور نگرانی قبول کرنا مثلاً کسی شخص کو اپنے زہد پر فخر ہو تو وہ زہد کے بعض ایسے مطالبات دریافت کرے جن کی تکمیل ابھی رہتی ہو۔ پھر کسی ایسے شخص کے پاس جائے جو زہد میں اس سے بڑھ کر ہو اور ان تقاضوں پر عامل بھی ہو اور اس سے درخواست کرے کہ "جناب! میرے زہد میں یہ کمی رہ گئی ہے اسے پورا کرنے کے لیے میری رہنمائی فرمائیں۔ میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گے۔"

مندرجہ بالا تینوں تدابیر (یعنی نمبر ۴، ۵ اور ۶) کا معالجاتی کردار یکساں ہے جو تعلیم قرآن کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔

7. جو چیز بنائے عُجب ہو اُسے عیب کی طرح چھپانے کی کوشش کی جائے اور بالکل عام آدمی کی طرح رہن سہن اور انداز گفتگو (وغیرہ) اختیار کیا جائے۔ اور یہ کام اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک عُجب کے ازالے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس کے بعد پھر اپنے ذوق پر عمل کرے۔

۞۞۞

غضب

حکم ربانی

—﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴾

(الشوریٰ:۴۲:۳۷)

''(مومن وہ ہیں) جو بڑے گناہوں اور بے حیائی سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔''(۳۷)

—﴿ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ...... ﴾

(الانبیاء:۲۱:۸۷)

''اور اسی طرح مچھلی والے (یونس نبی پر بھی ہم نے فضل کیا۔ یاد کرو) جب کہ وہ اپنی قوم سے غضبناک ہو کر چلے گئے اور وہ سمجھے کہ ہم اس بات پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔''(۸۷)

فرمان نبوی

—''ليس الشديد بالصرعة، انما الشديد الذى يملك نفسه عند الغضب۔''(۱)

پہلوان اور طاقت ور وہ نہیں ہے جو مد مقابل کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان اور شہ زور در حقیقت وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔

—''عن ابى هريرةؓ، ان رجلاً قال للنبى اوصنى. قال: لاتغضب، فردّد ذلك مراراً قال: لاتغضب''(۲)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب

(۲) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب

سے عرض کیا کہ: حضرت مجھے کوئی نصیحت فرمائیے — آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ غصہ مت کیا کرو۔ اس شخص نے اپنی درخواست کئی بار دہرائی کہ حضرت مجھے کچھ اور نصیحت فرمائیے مگر آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ: غصہ مت کیا کرو۔''

س: غضب کیا ہے؟

ج: غضب کا تعلق ان بیماریوں سے ہے جو نفس کے تخریبی جوش سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ تخریبی جوش کبھی تو صحیح وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اکثر غلط وجہ سے۔ بالجملہ غضب کہتے ہیں نفس کے اس اشتعال کو جس میں آدمی:

— صحیح اور غلط میں تمیز فراموش کر دیتا ہے

— انصاف کی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے

— کسی دوسرے بڑے گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے

ممکن ہے کہ یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ واقع ہو جائیں اور ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی ایک چیز کارفرما ہو۔

پہلی تعریف یعنی صحیح اور غلط کی تمیز کھو بیٹھنا یہ ہے کہ شدت غضب سے دماغ ماؤف ہو جائے۔ اس کا مظاہرہ عام ہے لہٰذا اس کی مثالوں کی ضرورت نہیں۔

غصے میں انصاف کی حدود سے تجاوز کر جانا یہ ہے کہ غصے کا سبب ٹھیک ہو مثلاً حفظ آبرو، حمیت دینی وغیرہ لیکن اس غصے کے نتیجے میں جو کام سرزد ہو وہ شریعت کی مقرر کردہ حدود سے باہر نکل جائے مثلاً کسی نے گالی دی تو جواب میں اسے بھی گالی دینا، کسی نے مال غصب کر لیا تو جواب میں اس کی بھی کوئی چیز چھین لینا یا کسی نے گمراہی کی کوئی بات کی تو ردعمل میں اسے کافر اور مشرک کہہ دینا وغیرہ۔ اس طرح کے تمام مواقع پر محرک غضب بالکل ٹھیک اور جائز ہے لیکن اس پر جس طرح عمل کیا گیا وہ شرعاً ناروا ہے۔

غضب کی تیسری تعریف اس کی دوسری تعریف سے اصولاً مختلف نہیں ہے لیکن سہولت فہم کے لیے ہم نے اسے الگ بیان کیا ہے۔ اس طرح کا غضب عموماً اپنی بنیاد میں ایسا ہوتا ہے کہ اسے جائز کہا جا سکتا ہے نہ حرام یعنی آدمی کو ایسی صورت حال پیش آ سکتی ہے جہاں وہ غصہ نہ کرے تو اچھا ہے اور اگر کرے تو شرعاً برا نہیں مثلاً کسی کی غلط تنقید پر بہتر تو یہی ہے کہ تحمل سے کام لیا جائے لیکن اگر غصہ آ جاتا ہے تو اس میں بھی شرعاً کوئی عیب نہیں۔ شریعت اسے تب مذموم کہے گی جب اس غصے پر عمل غلط طریقے سے کیا جائے مثلاً اگر کوئی آپ سے یہ کہہ دے کہ تم بہت نکمے ہو تو اس پر آپ کا برا ماننا شرعاً قابل گرفت نہیں ہے لیکن اس کے جواب میں اسے نکما کہنا یا اس کے کسی اور واقعی یا فرضی نقص کا اظہار کرنا یا اس سے تعلق منقطع کر لینا، یہ وہ صورتیں ہیں جہاں شریعت اپنا فیصلہ دیتی ہے کہ یہ ایسا گناہ ہے جو اس شخص کے گناہ سے بڑھ گیا ہے جس نے آپ کو نکما کہا تھا۔

غضب کا مقتضی عموماً مغضوب کی تحقیر، اسے نقصان پہنچانا اور منفی انداز سے بدلہ لینا ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مغضوب الغضب آدمی اللہ کے خوف سے محروم ہو جاتا ہے دوسرے الفاظ میں یہ کہ اللہ سے ڈرنے والا کبھی مغضوب الغضب نہیں ہوتا۔

س: غضب کا علاج کیا ہے؟

ج: یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ غصہ ہر حال میں اور ہر موقع پر غلط نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں غصے کا دل میں پیدا ہونا اور زبان و عمل سے اس کا اظہار شرعاً مطلوب ہوتا ہے۔ لہذا غصے کو اس طرح نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو ساری کی ساری بری ہو۔ غصے کا محرک عام طور پر کوئی خلاف مرضی چیز ہوتی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک تربیت یافتہ نفس جس کی مرضی اللہ کی مرضی کے تابع ہو چکی ہو، وہ بھی غصے میں آئے گا لیکن صرف ان موقعوں جب غصہ کرنا دین کا تقاضا ہو۔

جہاں دین کی اہانت اور نافرمانی کی جارہی ہو وہاں غصے کا احساس و اظہار نہ کرنا ایک بڑا دینی نقص ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ سنت معروف ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی کسی ذاتی حق تلفی سے غصہ نہیں آتا تھا لیکن اگر کوئی شخص اللہ کے حقوق اور حدود کی خلاف ورزی کرتا تھا تو آپ ﷺ سے بڑھ کر غضبناک ہونے والا بھی کوئی نہ ہوتا تھا(۱)۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ غصے کا ازالہ مطلوب نہیں ہے بلکہ غصے کا صحیح مصرف اور محل مطلوب ہے۔ وہ غصہ جو شرعاً ایک برائی ہے اس کے علاج میں مندرجہ ذیل تدابیر مفید ہوسکتی ہیں:

۱۔ اللہ کی رحمت اور مغفرت کا تصور کرنا یعنی یہ خیال کہ نہ جانے میری کتنی نافرمانیاں ہوں گی جو اللہ تعالیٰ نظر انداز کیے جارہے ہیں۔ اگر وہ بھی میری طرح خلاف مرضی باتوں پر غضبناک ہونے لگیں تو میں اگلا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں پا سکتا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی سنت کے اس حصے کا کثرت سے مطالعہ، تذکرہ اور استحضار جس سے آپؐ کی شفقت، تحمل اور بردباری کا اظہار ہوتا ہے، مفید ہے۔

۲۔ کثرت ذکر خصوصاً تعوذ، استغفار اور درود شریف

۳۔ اپنی سمجھ اور ذوق کے مطابق ایسے معمولات اختیار کرنا جن سے اللہ کا خوف دل میں پیدا ہو اور ترقی پائے۔

۴۔ اگر کسی پر ناجائز غصہ کیا ہو تو اس سے مبالغے کے ساتھ معافی طلب کرنا۔

۵۔ چھوٹے بچوں (اطفال) کی صحبت میں وقت کا ایک حصہ گزارنا۔

۶۔ بعض اوقات غصہ کسی جسمانی یا ذہنی بیماری کی وجہ سے بھی پیدا ہوجاتا ہے ایسی صورت میں اس بیماری کا علاج ہی غصے کا علاج ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب مباعدته للآثام۔

احادیث سے غضب کے مندرجہ ذیل علاج بھی ہمارے سامنے آتے ہیں:

۷۔ تعوذ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پڑھنا(۱) کیونکہ نفس انسانی میں تموج اور اشتعال اوصاف نار میں سے ہے(۲) جو مادۂ تخلیق شیطان ہے لہذا اس شیطانی وصف کے بُعد کے لیے تعوذ پڑھنا مفید ہے۔

۸۔ عدم حرکت (۳)(یعنی بیٹھ جانا یا لیٹ جانا) کیونکہ غصہ عموماً Situational اور نفس میں تموج کے سبب ہوتا ہے لہذا عدم حرکت اس کی برودت میں ممدو معاون ہوتی ہے۔

۹۔ خاموشی اختیار کر لینا کہ غصے کے اظہار کا بڑا آلہ زبان ہی ہے۔(۴)

آخر میں یہ بات ہم ایک بار پھر واضح کر دیں کہ غصہ ان چیزوں میں شامل ہے جو مکمل طور پر جائز یا ناجائز نہیں بلکہ ان کا استعمال اور مقصد ان کے حلال یا حرام ہونے کا تعین کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہ غصے کی چار قسمیں ہیں:

مباح: یعنی ایسا غصہ جس کی وجہ شرعاً صحیح ہو نہ غلط اور جس کا احساس و اظہار اچھا ہو نہ برا۔ تاہم تزکیہ پیش نظر ہو تو مباح غصے سے بھی بچنے کی تدبیر مفید ہوتی ہے۔

حلال: یعنی اپنی حق تلفی پر جوابی کاروائی کے طور پر غصہ کرنا۔

حرام: اس کی تفصیل واضح ہے۔

واجب: یہ وہ غصہ ہے جو خالصتاً اللہ کے لیے ہو مثلاً کفر و شرک سے نفرت اور اس کا عملی اظہار۔ اس کی بنیاد اس دینی حمیت پر ہے جس سے محروم ہو کر آدمی کا اسلام ناقص رہ جاتا ہے۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی من السباب واللعن

۲،۳۔ سنن ترمذی، کتاب الفتن، باب ما اخبر النبیؐ اصحابہ بما ھو کائن۔

۴۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۱ ص ۲۲۷، ۲۸۳، و ج ۵ ص ۳۴، ۵۲ وغیرہ

حسد

حکم ربانی

—﴿ اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾(النساء۴:۵۴)

کیا انہیں اس بات کا حسد ہے کہ کیوں اللہ نے مسلمانوں کو اپنے فضل سے نوازا ہے؟

—﴿......وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴾(الفلق ۱۱۳/ ۵)

''(اللہ کی پناہ مانگو) ہر حسد کرنے والے کے حسد سے۔

فرمانِ نبوی

—''اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔''(۱)

حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

—''دَبَّ اِلَیْکُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَکُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِیَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰکِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ۔''(۲)

اگلی امتوں کی مہلک بیماری یعنی حسد وبغض تمہاری طرف چلی آرہی ہے، یہ بالکل صفایا کردینے والی اور مونڈ دینے والی ہے (پھر اپنا مقصد واضح کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا) میرے اس کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ بالوں کو مونڈنے والی ہے، بلکہ یہ مونڈتی ہے اور بالکل صفایا کردیتی ہے دین کا۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب الحسد

(۲) جامع الترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب ماجاء فی ظن السوء

س: حسد کسے کہتے ہیں؟

ج: کسی آدمی میں کوئی ایسی خوبی دیکھ کر جو ہم میں یا تو کم پائی جاتی ہو یا سرے سے نہیں پائی جاتی یہ تمنا کرنا کہ کاش یہ وصف اس آدمی سے چھن جائے، حسد ہے۔

س: حسد کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: حدیث شریف میں آیا ہے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ خشک لکڑیوں کو ختم کر دیتی ہے۔(۱)

یعنی حسد کا تعلق ان خرابیوں سے ہے جو تمام نیکیوں کو متاثر کرتی ہیں۔اس کے مضر اثرات کی کچھ تفسیر اس طرح ہے:

1. طبیعت میں پستی پیدا ہو جاتی ہے
2. محبت کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے
3. خیر خواہی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا
4. صبر و شکر کی توفیق نہیں ملتی
5. دین جن احوال کو پسند کرتا ہے، ان میں سے کوئی حال حاسد کو پسند نہیں ہوتا—— غور سے دیکھا جائے تو حسد کے اس ایک نتیجے ہی میں اس کے سارے موجبات شامل ہیں۔

س: حسد کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا جو بھی علاج ہوگا اس کا غالب عنصر محبت اور خیر خواہی کو بنایا جائے گا مثلاً آدمی اپنے محسود کو جس نعمت سے محروم دیکھنا چاہتا ہے اس کے حق میں اس نعمت اور دیگر نعمتوں کے حصول، بقاء اور اضافے کی تکلف کے ساتھ دعا کرنا یہاں تک کہ یہ داعیہ کمزور یا ختم ہو جائے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد

2. حسد کے غلبے کو ٹالنے کی ایک ترکیب یہ بھی ہے کہ عین حالتِ حسد میں اپنے اوپر ہونے والی کسی رحمت کو یاد کرلیا جائے جو محسود میں نہیں پائی جاتی —— یہ ایک وقتی تدبیر ہے اور کچھ ایسی پسندیدہ بھی نہیں ہے لیکن چونکہ غلبۂ حسد کو رفع کرنے میں معاون ہوسکتی ہے لہذا عارضی طور پر اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔
3. محسود کی تعریف وتوصیف کرنا، خصوصاً ان معاملات میں جو باعث حسد ہیں۔
4. حدیث شریف میں وارد درود شریف کے ایک صیغے "اللھم صل علی سیدنا محمد عبدک ورسولک وصل علی المومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات "(۱) کی کثرت اس خیال سے رکھنا کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت جو مجھے حاصل ہے وہ یہ کہ میں مومن ومسلمان ہونے کی وجہ سے مستحق صلاۃ ہوں۔ یہ دھیان اگر اچھی طرح قائم ہوگیا تو حسد کا علاج فی الفور ممکن ہے۔
5. دو رکعت نماز تو بہ دن میں ایک مرتبہ ورنہ کم از کم ہفتے میں ایک بار جس کے تمام ارکان میں استغفار کی کثرت کی جائے اور قعدہ میں التحیات کو کچھ بار دہرایا جائے۔ اس میں معانی کا استحضار بھی ضروری ہے۔
6. عام طور پر حاسد، بخیل اور سنگدل بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات بخل اور دل کی سختی ختم ہو جائے تو حسد سے خود بخود نجات مل جاتی ہے لہذا اگر کوئی شخص اپنے اندر یہ دو علامتیں موجود پائے تو حسد کے علاج کا آغاز انہی کے علاج سے کرنا چاہیے۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ وہ خرابیاں جو طبیعت کا حصہ بن گئی ہوں نہایت خطرناک ہوتی ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے آدمی مستقلاً حالت معصیت میں رہتا ہے۔ حسد کا شمار ایسی ہی بیماریوں میں ہوتا ہے لہذا اس کے علاج میں ہمت ومجاہدے سے کام لینا چاہیے

(۱) امام بخاری، الادب المفرد، باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اور علاج کی کامیابی کی صورت میں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے بلکہ اس وقت بھی ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں دوبارہ اس میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آجائے۔ واضح بات یہ ہے کہ بندگی کا بہت بڑا حصہ بلکہ بندگی کی سوچ طبیعت کی سلامتی کا نام ہے۔ طبیعت اگر دین اور فضائل دین سے مطابقت نہیں رکھتی تو ہر چیز بے فائدہ ہے، خواہ بڑا علم ہو یا بڑا عمل۔

مذکورہ بالا حدیث شریف پر ایک دفعہ پھر غور کریں اور دیکھیں کہ وہ کون سی نیکی ہے جسے حسد فنا نہیں کر دیتا۔ یقیناً ایسی ایک نیکی بھی نہیں مل سکتی۔ لہٰذا اسی کو حسد کا بڑا ضرر سمجھیں اور اس کے علاج میں جتنا مبالغہ اور مجاہدہ ممکن ہو، کریں۔

7 محسود سے دوستی کا تعلق پیدا کرنا خواہ اس سے میل جول کی صورت میں، خواہ غائبانہ۔

س: رشک اور حسد کی بعض خصوصیات آپس میں ملتی جلتی ہیں حالانکہ رشک جائز ہے اور حسد حرام۔ مناسب ہوگا کہ ان کا بنیادی فرق بتا دیا جائے؟

ج: ان میں فرق یہ ہے کہ رشک میں قلق ہوتا ہے کہ فلاں آدمی کی خوبی مجھ میں کیوں نہیں ہے جبکہ حسد اس قلق پر مبنی ہوتا ہے کہ فلاں آدمی میں وہ خوبی کیوں ہے، جو مجھ میں نہیں۔ رشک میں ایک مثبت پہلو یہ پایا جاتا ہے کہ آدمی اس خوبی کے حصول کی تگ و دو کرتا ہے جبکہ حسد میں یہ پہلو اگر پایا بھی جائے تو بھی غالب کیفیت یہی رہتی ہے کہ مطلوبہ خوبی دوسرے سے زائل ہو جائے، پھر چاہے مجھے حاصل ہو یا نہ ہو۔

بُغض اور کینہ

حکم ربانی

— ﴿ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ﴾ (المائدہ:۵:۵۴)

(مومن وہ ہیں جو) مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہیں۔

— ﴿ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ﴾ (الفتح:۴۸:۲۹)

— محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں، آپس میں مہربان۔

فرمانِ نبوی

— ''لَاتَبَاغَضُوْا، وَلَاتَحَاسَدُوْا، وَلَاتَدَابَرُوْا، وَلَاتَقَاطَعُوْا، وَكُوْنُوْا عِبَادَاللّٰهِ إِخْوَانًا، وَلَايَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَهْجُرَاَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ'' ۔(۱)

ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ، نہ آپس میں تعلق منقطع کرو اور اے اللہ کے بندو، بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (کسی مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال چھوڑے رکھے۔

— ''دب اليكم داء الامم قبلكم الحسد والبغضاء هماالحالقة لا اقول تحلق الشعر ولكن تحلق الدين''

اگلی امتوں کی مہلک بیماری یعنی حسد و بغض تمہاری طرف چلی آرہی ہے یہ بالکل صفایا کردینے والی اور مونڈ دینے والی ہے (پھر اپنا مقصد واضح کرتے ہوئے فرمایا) میرے اس کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ بالوں کو مونڈنے والی ہے بلکہ یہ مونڈتی ہے اور بالکل صفایا کردیتی ہے دین کا۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماينهى عن التحاسد

(۲) جامع الترمذی، ابواب صفة القيامة، باب ماجاء في ظن السوء

س: کیا بغض اور کینہ میں فرق ہے؟

ج: بغض دوسرے کی بدخواہی ہے اور کینہ اس بدخواہی پر عمل کرنے کی شدید خواہش۔ ان میں دوسرا فرق یہ ہے کہ بغض کے لیے کوئی وجہ ضروری نہیں ہوتی جب کہ کینے کا کوئی جھوٹا سچا سبب ہوا کرتا ہے۔ عام معنی میں یہ دونوں معروف ہیں لہٰذا تفصیل میں جانے کی غالباً ضرورت نہیں۔

س: اگر آپ بات کو ایک دو مثالوں سے واضح کر دیں تو عنایت ہوگی؟

ج: مثلاً ایک شخص کسی آدمی سے بلا وجہ چڑنے لگے اور وہ چڑ رفتہ رفتہ بدخواہی بن جائے تو یہ بغض ہے۔ دوسری طرف کینہ اس کیفیت کا نام ہے جس میں آدمی کو کسی سے کوئی شکایت پیدا ہو جاتی ہے مگر بھلے لوگوں کی طرح اس شکایت کا ازالہ کرنے کی بجائے وہ آدمی اسے دل میں پالتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ شکایت بغض میں بدل جاتی ہے اور بغض بڑھتے بڑھتے عداوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کینہ عداوت کی اسی صورت کو کہتے ہیں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ بغض آدمی کو اس شخص سے دوری اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کے لیے دل میں بغض پیدا ہو جائے جب کہ کینہ اس آدمی کو نقصان پہنچانے کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بغض غصے سے مماثلت رکھتا ہے اور کینہ حسد سے۔

س: بغض اور کینے کے مظاہر تو ہر کوئی جانتا ہے البتہ ان کے اسباب پر کچھ روشنی ڈال دی جائے تو بہتر ہوگا؟

ج: بغض اور کینے کے اسباب مشترک ہیں یعنی جس وجہ سے بغض پیدا ہوتا ہے وہی وجہ کینے کو بھی جنم دیتی ہے۔ ان اسباب کی مختصر فہرست یہ ہے:

— ناشکری

— دل کا مسلمانوں کی محبت، خیر خواہی اور اکرام سے خالی ہونا۔

— احساسِ کمتری

— اپنے بارے میں ناروا حد تک بڑھی ہوئی زود حسی اور مریضانہ خود پسندی۔

— اپنی بڑائی کی خواہش

— دنیاوی ناکامیوں سے مبالغے کے ساتھ متاثر ہونا۔

س: بغض اور کینہ کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: دینی نقصانات

۱۔ جھوٹ، غیبت اور بہتان

۲۔ مسلمان کو تکلیف پہنچانے کی خواہش

۳۔ تجسس اور سازش

۴۔ ہر دینی عمل سے طبیعت میں بے زاری کا پیدا ہو جانا۔

۵۔ اللہ کے خوف اور محبت کا کمترین درجہ بھی گنوا بیٹھنا۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت کا تقریباً فقدان اور آپ ﷺ کی نسبت کا ملحوظ نہ رہنا۔

۷۔ دین کو ہر چیز پر فوقیت دینے کا مزاج پیدا نہ ہونا۔

۸۔ نفس امارہ کی مزاحمت کا جذبہ اور طاقت نہ رہنا۔

۹۔ نفاق

بغض و کینہ کے انہی نقصانات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں انہیں شیطانی فعل قرار دیا ہے۔ (آل عمران ۵:۹۱) اور نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو سختی سے بغض و کینہ سے منع کیا ہے (۱) کیونکہ یہ سارے اخلاق حسنہ کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ (۲)

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی عن التحاسد و التدابر

۲۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۱ص ۱۶۵، ۱۶۷

نفسیاتی نقصانات

۱۔ نفس میں خوشی، غم، محبت، نفرت وغیرہ ایک قدر پر قائم ہوتے ہیں۔ یہ مرض اس قدر کو مجروح کر کے ان تمام داعیات کو غیر متوازن کر دیتا ہے۔

۲۔ بغض سے تخریبی طبیعت اور کینے سے منفی سوچ پوری شخصیت پر غالب آجاتی ہے۔

۳۔ اس مرض میں مبتلا شخص تعلق کے تجربے اور کیفیت سے محروم ہو جاتا ہے جس سے شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔

۴۔ بغض اور کینے سے طبیعت میں اذیت پسندی پیدا ہو جاتی ہے جو ایک خطرناک نفسیاتی عارضہ ہے۔

۵۔ ایسے مریض کو سچی خوشی نصیب نہیں ہوتی جو شخصیت کے نارمل نشوونما کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا درخت کے لیے پانی۔ یہاں خوشی کو اطمینان کے معنی میں بھی لینا چاہیے جس کے بغیر انسان کے لیے اس کا وجود بے جواز، بے معنی اور بے حوالہ بن کر رہ جاتا ہے۔

۶۔ بغض اور کینہ اگر شخصیت پر مکمل غلبہ حاصل کر لے تو آدمی دوہری شخصیت یعنی شیزوفرینیا کا مریض بن جاتا ہے، جو نفسیاتی بیماریوں میں غالباً سب سے خطرناک بیماری ہے۔

دنیاوی اور معاشرتی نقصانات

ان کے نقصانات اتنے واضح ہیں کہ ہر شخص جانتا ہے لہذا انہیں بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بس اتنا اشارہ کافی ہے کہ یہ خرابی انسانی شخصیت کے پورے ماحول کو ناسازگار بنا دیتی ہے اور دنیاوی و معاشرتی زندگی کی ہر سطح سے اسے باہر نکال پھینکتی ہے۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا علاج حسد کے باب میں دیکھ لیا جائے۔

جُبن (بزدلی)

حکم ربانی

—﴿ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً .... ﴾ (النساء:۴:۷۷)

پھر جب ان پر جہاد فرض ہوا تو ان میں سے ایک گروہ انسانوں سے ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

—﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْأَدْبَارَ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَأْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ (الانفال:۸:۱۵،۱۶)

اے ایمان والو! جب تمہارا مقابلہ کافروں کے لشکر سے ہو تو پیٹھ نہ دکھاؤ۔ اور جس نے ایسے موقع پر پیٹھ دکھائی تو اس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا، اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔ البتہ اگر پیچھے ہٹنا جنگی چال کے لیے ہو یا اپنے دوسرے لشکر سے ملنے کے لیے ہو تو اس کی اجازت ہے۔

فرمان نبوی

— ”شر ما في رجل شحّ هالع وجبن خالع“(۱)

انسان میں سب سے بری خصلتیں یہ ہیں کہ وہ ہر وقت مال کی حرص میں گھلتا کڑھتا رہے اور بزدلی کی وجہ سے ہر وقت اکھڑا اور گھبرایا ہوا رہے۔

— ”من مات ولم يغزو ولم يحدث نفسه بغزو، مات على شعبة من النفاق“(۲)

جو شخص اس حال میں مرے کہ اس نے جہاد (قتال) کیا ہو اور نہ اس کے دل میں اس کی آرزو ہی پیدا ہوئی ہو تو وہ گویا نفاق کی ایک خصلت پر مرا۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب في الجرأة والجبن

(۲) صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب ذم من مات ولم يغز

س: جُبن کی تعریف؟

ج: جہاں شریعت، حمیت اور عام معاشرتی اخلاق کوئی خطرہ مول لینے کا تقاضا کریں وہاں سے آدمی جان وغیرہ کے ڈر سے جھجھک جائے یا منہ موڑ لے تو یہ جُبن ہوگا یعنی دینی مقاصد کے لیے درکار امکانی قربانیاں دینے سے ڈرنا۔ بزدلی میں یہ بات واضح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ آدمی اپنے جان و مال کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ترجیح دیتا ہے۔ ایک بات البتہ ملحوظ رہنی چاہیے کہ بعض لوگ طبعاً کمزور دل کے ہوتے ہیں اور جلدی ڈر جاتے ہیں۔ ان کی اس حالت کو بزدلی سے تعبیر نہیں کیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اس کی بنیاد پر احکام سے روگردانی نہ کریں اور چاہے خوفزدگی کی حالت میں نکلیں مگر نکل پڑیں۔

س: بزدلی کے مضر اثرات کیا ہیں؟

ج: بزدلی وہ مرض ہے جو یوں سمجھیں کہ پورے اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام اپنے ماننے والے سے جو پہلا تقاضا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی خود کو، آل و اولاد کو اور اپنے مال و اسباب کو اللہ پر نثار کرنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہے۔ یہ حال نہ ہو تو دین کا کوئی بھی تقاضا اچھی طرح پورا نہیں ہو سکتا۔ بزدل آدمی اس بنیادی مطالبے سے انحراف کرتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ بدترین خصلتیں جو کسی شخص میں ہو سکتی ہیں وہ ہیں بزدلی اور بخل۔(۱)

اس اصولی ضرر کے بعد اس سے پیدا ہونے والی چند دیگر خرابیاں حسب ذیل ہیں:

۱۔ اللہ کی محبت، اطاعت اور خوف سے محرومی

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت میں کمی اور آپ ﷺ کی دی ہوئی بشارتوں پر مطلوبہ یقین پیدا نہ ہونا۔

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب في الجرأة والجبن

۳۔ فضائلِ جہاد سے محرومی

۴۔ واضح احکام میں تاویل وتحریف یعنی بزدلی کا شکار آدمی اپنے اس نقص پر پردہ ڈالنے کے لیے جہاد وغیرہ کے واضح احکام میں بھی ردوبدل کرنے لگتا ہے جو اپنی جگہ خود بزدلی سے بڑا گناہ ہے۔

۵۔ خودغرضی، بخل، رشوت دینا وغیرہ

۶۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے دینی فرض کو ادا نہ کرسکنا۔

۷۔ شہادت اور شوق شہادت سے محرومی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اس حالت میں مرے کہ نہ اس نے جہاد کیا ہو اور نہ اس کے دل میں اس کی آرزو ہی پیدا ہوئی ہو تو وہ گویا نفاق کی ایک خصلت پر مرا۔(۱)

بزدلی کے انہی نقصانات کی وجہ سے نبی کریم ﷺ ہمیشہ اس سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔(۲)

س: بزدلی کا علاج کیا ہے؟

ج: بزدلی اخلاقی خرابی ہی نہیں بلکہ طبعی وجسمانی مرض بھی ہے یا یوں کہہ لیں کہ بزدلی کا بیشتر حصہ نفسیاتی نوعیت کا ہوتا ہے لہذا اس کے علاج میں پہلے تو یہ دیکھا جائے گا کہ کہیں یہ کسی نفسیاتی یا جسمانی بگاڑ کا نتیجہ تو نہیں ہے؟ اگر ایسا ہو تو اس کے علاج کے لیے طبیب امراض جسمانی یا امراض ذہنی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اور اگر بزدلی کا تعلق قلب کی ایسی کمزوری سے ہو جسے شریعت بھی ایک خرابی شمار کرتی ہے تو اس کی کمزوری کے اسباب تلاش کرکے انہیں رفع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

عام طور پر بزدلی کے بڑے بڑے اسباب یہ ہوتے ہیں:

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب ذم من مات ولم یغز۔

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب مایتعوذ من الجبن

۱۔ حبِّ دنیا، جس میں مال، اولاد، منصب، زندگی وغیرہ کی محبت بھی شامل ہے۔

۲۔ آخرت پر یقین میں کمی

۳۔ دین کا غلط تصور مثلاً دین اجتماعی زندگی کی بقا کے لیے کچھ قربانیاں اور مجاہدات چاہتا ہے اس کی اہمیت کو نہ سمجھنا یا نہ ماننا اور وفقط شخصی فضائل کے ایک آرام دہ تصور میں گرفتار رہنا۔ بار ہا دیکھنے میں آیا ہے کہ گوشہ نشین اور زاہد قسم کے لوگ دین کی راہ میں وہ قربانیاں دینے سے بچتے ہیں جو وقت آنے پر قریب قریب ہر مسلمان پر واجب کر دی گئی ہیں مثلاً جان کا ایثار، مال کا ایثار وغیرہ۔

ان تمام اسباب کو رفع کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں کسی بھی نوعیت کا اجتماعی جہاد کرنے والوں سے ایسا تعلق پیدا کیا جائے جیسا استاد اور شاگرد، پیر اور مرید یا حاکم اور محکوم میں ہوتا ہے۔ ایسے مجاہدین کی کسی جماعت میں داخل ہو کر ان کے نظم کی پابندی کر لی جائے تو بزدلی کا بہت جلد قلع قمع ممکن ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اسلام کے نام پر سر ہتھیلی پر لیے پھرنے والوں میں سبھی لوگ مخلص اور صحیح معنوں میں مجاہد نہیں ہیں لہذا یہ قدم کسی صاحب اخلاص عالم کے مشورے سے اٹھایا جائے تاکہ یہ نہ ہو کہ بزدلی کا علاج تو ہو جائے مگر اس کے نتیجے میں سفاکی اور بہیمیت کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آئے۔

اس مرض کا دوسرا علاج تبلیغ ہے یعنی اپنے اردگرد لوگوں کو دینی احکام پر چلنے کی تلقین کرتے رہنا۔ تبلیغ سے آدمی میں ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ حق بات کسی سے بھی اور کہیں بھی کر سکتا ہے۔ بس یہ صلاحیت پیدا ہو جائے تو بزدلی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

❂❂❂

کسل (کاہلی و بے رغبتی)

حکم ربانی

— ﴿ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾
(العنکبوت ۲۹:۶۹)

جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ضرور ان کو اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

— ﴿ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ ﴾ (الحجر ۱۵:۹۹)

اور اپنے رب کی عبادت کرتا رہ یہاں تک کہ تجھے موت آ جائے۔

فرمان نبوی

— ''عن عائشه ان النبی ﷺ کان یقوم من اللیل حتی تنفطر قدماہ۔''(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کو اتنا لمبا قیام فرماتے کہ آپ کے پیر سوج جاتے۔

— ''نعمتان مغبون فیهما کثیر من الناس: الصحة والفراغ۔''(۲)

دو نعمتیں ہیں، اکثر لوگ (ان کے غلط استعمال کی وجہ سے) خسارے اور گھاٹے میں رہیں گے، صحت اور فراغت۔''

س: کسل سے کیا مراد ہے؟

ج: کسل ایسی سستی اور کاہلی کو کہتے ہیں جو بے رغبتی سے پیدا ہو۔ شریعت میں کسل کو مرض بتایا گیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے تمام اعمالِ خیر متاثر ہوتے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں کسل کا مطلب ہوگا اللہ کی بندگی میں اس لیے کوتاہی کرنا کہ خود بندگی سے بیزاری محسوس ہو۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۲) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ما جاء فی الرقاق وان لا عیش الا عیش الآخرۃ۔

اس تعریف کی رو سے کسل ایک نہایت خطرناک مرض ہے جس کی طرف فوری توجہ نہ کی جائے تو یہ بہت تیزی سے بڑھتا ہے اور بالآخر عبودیت کی موت پر ختم ہوتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مظہر بس ایک ہے: اللہ اور رسول ﷺ کے ہر حکم کو ٹالنے کی شعوری اور ارادی کوشش کرنا اور اگر کسی دباؤ سے تعمیل کرنی ہی پڑ جائے تو بیزاری، بے دلی، بے دھیانی اور بے سلیقگی سے عمل کرنا (النساء ۴:۱۴۲)۔ کسل کا مریض بندگی کو بیگار سمجھنے لگتا ہے اور اس سے چھٹکارا پانے کی خواہش رکھتا ہے۔ کسل کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے اللہ، رسول اللہ ﷺ اور پورے دین سے ایک گہری اور شدید لاتعلقی بلکہ بیزاری پیدا ہو جاتی ہے۔

• تاہم یہ ملحوظ رہے کہ جُبن کی طرح کسل کا مرض بھی اکثر اوقات کسی جسمانی یا نفسیاتی وجہ سے نمودار ہوتا ہے۔ کسل کا مذکورہ بالا نقصان صرف انہی لوگوں کو پہنچتا ہے جو ذہنی اور جسمانی طور پر عمل کی مطلوبہ قوت رکھنے کے باوجود دینی احکام کی بجا آوری میں کسمساتے ہوں۔ ایسے اشخاص جو زندگی کے تمام معاملات میں کاہلی کا رویہ رکھتے ہوں اس انتہائی نقصان سے تو محفوظ رہتے ہیں لیکن انہیں بھی بعض محرومیوں کا سامنا بہر حال کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا عافیت کی راہ یہی ہے کہ کسل اگر طبعی بھی ہو تو اسے ایک دینی نقص سمجھ کر اس کا علاج کرنے کی فکر کی جائے۔ باقی رہی کسل کی وہ قسم جو صرف دینی اعمال سے مخصوص ہو اور شعور اور ارادے کے ساتھ ہو تو ظاہر ہے کہ یہ ایک طرح سے دین کا صریح انکار ہے اور اس میں مبتلا آدمی اس وقت تک صحت یاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنا مسلمان ہونا دل سے قبول نہ کر لے۔ بہر حال اللہ کا خاص فضل ہے کہ کسل کی یہ قسم مسلمانوں کے اندر تقریباً ناپید ہے، یہ صرف منافقوں کے حصے میں آئی لیکن محدود ہونے کے باوجود چونکہ نفاق آج بھی ایک زندہ حقیقت ہے لہٰذا اصحابہؓ کی طرح ہمیں بھی اس خطرے سے غافل نہیں رہنا چاہیے اور ان

خرابیوں کی ابتدائی علامات کو بھی سنجیدگی سے لینا چاہیے جو اپنی انتہائی صورت میں منافقوں کا خاصہ ہیں۔

خلاصہ یہ کہ کسل کی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ طبعی کسل ایک عذر ہے جو آدمی کو خود اس کے فائدے کے کام بھی نہیں کرنے دیتی لیکن ارادی کسل خالص نفاق ہے اور اس کی موجودگی میں آدمی کا مسلمان ہونا کوئی حقیقی معنی نہیں رکھتا۔ طبعی کسل چونکہ شرعاً ایک حد تک قابل گرفت نہ ہونے کے باوجود اکثر ضروری احکام کی تعمیل میں رکاوٹ بنتا ہے لہذا اس کا علاج بھی ایک دینی ضرورت ہے اور اس کی طرف سے غافل رہنا ایک دینی نقص ہے۔

س: سوال یہ ہے کہ اگر کسل منافقوں کی عادت ہے اور اس سے مخلص مسلمانوں کو خطرہ نہیں ہوسکتا، تو پھر اسے زیر بحث لانے کا کیا فائدہ ہے؟

ج: نفاق کا وقوع ایک اور چیز ہے اور نفاق کا امکان دوسری چیز۔ ہم نے جو صحابہ کرامؓ کی مثال دی تھی تو اس سے یہی بتانا مقصود تھا کہ جس کا ایمان جتنا کامل ہوگا اس کا خوفِ نفاق بھی اسی مناسبت سے زیادہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ جس کے لیے ایمان، مرنے جینے سے بھی بڑا مسئلہ ہو وہ ایمان کے زوال کے خوف سے کبھی آزاد نہیں ہوسکتا۔ صحابہ کرامؓ کے خوفِ نفاق کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہیں، معاذ اللہ، خود پر منافق ہونے کا شبہ تھا بلکہ وہ اپنے ایمان میں اتنے کامل، مخلص اور سنجیدہ تھے کہ محض نفاق یا زوال ایمان کا بعید ترین امکان بھی انہیں فکرمند کرنے کے لیے کافی تھا۔ صحابہؓ کی مثال پیش کرنے کا مقصد غالباً اب واضح ہوگیا ہوگا کہ ہمیں کسی بھی حال میں بے فکر نہیں ہونا چاہیے اور چھوٹی سے چھوٹی دینی خرابی کو بھی اس کے انتہائی نتائج کی روشنی میں دیکھ کر اس کے علاج کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ کسل منافقوں کی نفسیات کا

چونکہ ایک ناگزیر حصہ ہے لہذا اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ صورت کو بھی دور کرنے کی ایسی ہی جدوجہد کرنی چاہیے جیسی کوئی سچا مسلمان نفاق سے بچنے کے لیے کر سکتا ہے۔ امید ہے اب ہماری بات واضح ہوگئی ہوگی۔

س: یہاں بار بار نفاق کا ذکر آ رہا ہے تو ازراہِ کرم یہ بھی واضح کر دیں کہ یہ لفظ یہاں کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟

ج: اس کو آپ کسی سخت قانونی معنوں میں نہ لیں بلکہ یہاں اس کا ایک عمومی مفہوم مراد ہے جو مسلمانوں کی نفسیات میں راسخ ہو چکا ہے یعنی ارادے اور شعور کے بڑے حصے میں دین کا نور موجود نہ ہو تو ایسے آدمی کو مسلمان ہونے کے باوجود، ہماری روایت میں، نفاق کے خطرے میں مبتلا ایک شخص کہا اور سمجھا جائے گا۔ جب ہم شعوری وارادی کسل کی بات کرتے ہیں تو اس کا واضح مفہوم یہی ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوا۔ یہاں نفاق کو اس کے قانونی معنی میں لینے کی بھی پوری گنجائش موجود ہے لیکن ہم اپنی گفتگو میں وہ فضا پیدا نہیں ہونے دینا چاہتے جس سے امید غائب ہو جائے اور مایوسی غالب آ جائے۔ اس لیے ہم نفاق کو اس کے عمومی مفہوم میں رکھنا پسند کریں گے تاکہ بعض واضح مشابہتوں کے باوجود آدمی میں یہ احساس بہرحال زندہ حالت میں موجود رہے کہ ٹوٹا پھوٹا ہی سہی مگر ابھی دین کے ساتھ میرا وہ تعلق باقی ہے جو خراب سے خراب صورت حال میں بھی مجھے مکمل تباہی سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

س: گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نفاق کی کسی علامت میں مبتلا ہونے کے باوجود آدمی خود کو مسلمان سمجھتا رہے تو اس کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ بہرحال کھلا رہے گا؟

ج: جی ہاں! ہمارے اس خیال کی تصدیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی میں چار بری عادتیں ہوں وہ پورے

کا پورا منافق ہے اور جس آدمی میں ان چار میں سے کوئی ایک بری عادت پائی جائے تو وہ اس حد تک منافق ہے جب تک کہ وہ اس عادت کو چھوڑ نہ دے۔ وہ چار عادتیں یہ ہیں: ا۔امانت میں خیانت کرنا ۲۔جھوٹ بولنا ۳۔وعدہ خلافی کرنا ۴۔اختلاف و تنازعہ میں شرافت کی حدود پھلانگ جانا۔(۱)

اس حدیث سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلمان میں بھی بعض اجزائے نفاق جمع ہو سکتے ہیں۔اس حالت کو نفاق تو یقیناً کہا جائے گا خواہ وہ عمل میں ہو یا عقیدے میں، لیکن اس کے حامل کو مسلمان ہی کی حیثیت سے مخاطب کیا جائے گا اور اس کے مسلمان ہونے کی کسی بھی سطح پر نفی نہیں کی جائے گی۔

س: کسل ایک بڑی بیماری ہے اس کے بارے میں جتنی وضاحت درکار تھی وہ تو بحمد اللہ ہوگئی اب اس کے علاج کی تدابیر بھی بتا دی جائیں تو بہتر ہوگا؟

ج: کسل کے معالجے میں مندرجہ ذیل تدابیر، ان شاء اللہ، مفید ثابت ہوں گی:

۱۔ تہجد، خواہ عشاء کے بعد ہی کیوں نہ ہو، یہ کسل کو دور کرنے کا قرآنی نسخہ ہے۔ (المزمل ۷۳:۶)

۲۔ ایسی مشغولیت اختیار کرنا جس میں ثواب ہو اور جسمانی مشقت بھی ہو مثلاً لوگوں کے کام کرنا، ورزش کرنا، مسجد میں جانے کا اہتمام رکھنا......وغیرہ۔

۳۔ زبان کو ذکر میں مشغول رکھنے کی کوشش کرنا۔ جس کی زبان ذکر سے تر رہتی ہو وہ کسل مندی کا شکار نہیں ہو سکتا۔

۴۔ طرز زندگی میں سادگی بلکہ مشقت اختیار کرنا

۵۔ سخت تھکن میں کم از کم دو رکعت نفل پڑھ لینا

۶۔ زیادہ وقت بڑوں کی صحبت میں رہنا، خواہ وہ دینی اعتبار سے بڑے ہوں یا دنیوی اعتبار سے۔

۱۔صحیح بخاری، کتاب الشھادات، من امر بانحاز الوعد

بُخل

حکم ربانی

—﴿وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ﴾(آل عمران۳:۱۸۰)

جن لوگوں کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہے مگر وہ اللہ کے لیے خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا ہے۔ جس مال و دولت میں وہ بخل کر رہے ہیں اس کا قیامت کے دن انہیں طوق پہنایا جائے گا اور یاد رکھو، آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا وارث اللہ ہے اور وہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

—﴿ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی وَمَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗٓ اِذَا تَرَدّٰی ﴾(الیل۹۲:۸۔۱۱)

جس نے بخل کیا، دین سے لاپروائی برتی اور نیک بات کو جھوٹ جانا تو ہم اسے دوزخ کی سختی میں پہنچا دیں گے اور اس کا مال اس کے کسی کام نہ آئے گا جب وہ دوزخ کے گڑھے میں گرے گا۔

فرمان نبوی

''اَلْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِنَ اللّٰہِ، بَعِیْدٌ مِنَ النَّاسِ، بَعِیْدٌ مِنَ الْجَنَّۃِ، قَرِیْبٌ مِنَ النَّارِ وَلَجَاھِلٌ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ۔''(۱)

بخیل اور کنجوس آدمی اللہ سے دور، یعنی قربِ خداوندی کی نعمت سے محروم ہے،

(۱)سنن الترمذی، کتاب البر، باب ماجاء فی السخاء

اللہ کے بندوں سے بھی دور ہے(کیونکہ اس کی کنجوسی کی وجہ سے سے وہ اس سے الگ اور بے تعلق رہتے ہیں)اور جنت سے دوراور دوزخ سے قریب ہے اور بلاشبہ ایک بے علم سخی اللہ تعالیٰ کوعبادت گزار کنجوس سے زیادہ پیارا ہوتا ہے۔

—''لایدخل الجنة خَبّ و لابخیل و لامنان۔''(۱)

دھوکہ باز، بخیل اور احسان جتانے والا جنت میں نہ جائے گا۔

س: بُخل کسے کہتے ہیں؟

ج: جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ حرص وبخل اپنی معنویت میں تقریباً ایک ہیں اس لیے بخل کی تعریف بھی حرص کے حوالے سے کی جاسکتی ہے۔ جو چیز آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے اس کی طلب میں کھپتے رہنا حرص ہے اور جو چیز ہاتھ میں ہے اسے ہر حال میں ہاتھ میں دبوچے رہنا بخل ہے۔ گویا حرص میں غیر موجود کی محبت غالب ہوتی ہے اور بخل میں موجود کی، چیز ایک ہی ہے جو بخل میں موجود ہے اور حرص وغیرہ میں غیر موجود۔

بخل کی سادہ سی تعریف یہ ہے: دولت یا دیگر دنیاوی چیزوں سے ایسی محبت کہ آدمی انہیں ایسے مواقع پر بھی صرف کرنے پر تیار نہ ہو جن کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید ہو اور جن کا اجر یقینی ہو یعنی بخیل وہ آدمی ہے جو مال وغیرہ کی محبت میں اس شدت سے گرفتار ہو کہ اللہ بھی اس سے کچھ طلب کرے تو وہ نہ دے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے الفاظ میں جس چیز کا خرچ کرنا شرعاً یا مروتاً ضروری ہو اس میں تنگ دلی کرنا بخل ہے۔(۲)

س: بخل کے نقصانات کیا ہیں؟

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البرّ والصلہ، باب ماجاء فی البخل

(۲) مولانا اشرف علی تھانوی، شریعت وطریقت (مرتب مولانا محمد دین) ص ۱۸۳، ادارہ اسلامیات، لاہور

ج: ۱۔ اللہ تعالیٰ، رسول اکرم ﷺ اور دین سے جو محبت فرض عین ہے وہ بخیل کو نصیب نہیں ہوتی۔

۲۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ بخل ہادم دین وملت ہے(۱) اس کا ایک مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بخل میں یہ اعلان پوشیدہ ہے کہ دنیا اور مال دنیا، نعوذ باللہ، اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے زیادہ محبوب اور اہم ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد ظاہر ہے کہ اسلام کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

۳۔ دنیا اور آخرت میں تحقیر اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ (''آل عمران:۳:۱۸۰)

۴۔ بخل کا تعلق نفس کی اس سطح سے ہے جو سب سے زیادہ پست ہے۔ بخیل شخص اس پست ترین سطح پر ساری زندگی گزار دیتا ہے۔

۵۔ بخل اسلام کی نشر و اشاعت اور عالمگیر غلبے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے بخل کے انہی نقصانات کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اسے نقیضِ ایمان قرار دیا ہے(۲) اور آپؐ ہمیشہ اس سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔(۳)

س: بخل کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا علاج وہی ہے جو حب دنیا اور حرص کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔

۱۔ صحیح مسلم، کتاب البرّ و الصلة، باب تحریم الظلم

۲۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، باب فضل من عمل فی سبیل اللّٰہ علی قدمه

۳۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذہ، باب الاستعاذہ من فتنة الدنیا

حرص وطمع

حکم ربانی

— ﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَايُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ' ﴾ (التوبہ:۹:۳۴)

جولوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ،آپ انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیں۔

— ﴿ ومن یُّوقَ شُحَّ نَفْسِه فَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (التغابن:۶۴:۱۶)

اور جنہوں نے اپنے آپ کو لالچ سے محفوظ رکھا تو ایسے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔

فرمان نبوی

— ''قدافلح من اسلم ورُزق کفافاوقنّعه اللّٰه بماآتاه''(۱)

کامیاب اور بامراد ہوا وہ بندہ جس کو حقیقت اسلام نصیب ہوئی اور اس کو روزی بھی بقدر کفاف ملی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس قدر قلیل روزی پر قانع بھی بنادیا۔

— ''اِيَّاكُمْ وَالشُّحَّ فَاِنَّمَاهَلَکَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالشُّحِّ ،اَمَرَهُمْ بِالْبُخْلِ فَبَخِلُوْاوَاَمَرَهُمْ بِالْقَطِيْعَةِ فَقَطَعوْاوَاَمَرَهُمْ بِالْفُجُوْرِ فَفَجَرُوْا''

حرص وطمع سے بچو، کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں۔اسی نے ان کو بخل کرنے کو کہا تو انہوں نے بخل اختیار کیا،اسی نے ان کو قطع رحمی (یعنی حقوق قرابت کی پامالی) کے لیے کہا تو انہوں نے قطع رحمی اختیار کی،اسی نے ان کو بدکاری کے لئے کہا تو انہوں نے بدکاریاں کیں۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب القناعہ

(۲) سنن ابی داوَد، کتاب الزکاۃ، باب فی الشح

س: حرص کیا ہے؟

ج: حرص نفس کی وہ بیماری ہے جس میں وہ اپنی ضرورت اور استحقاق سے زیادہ کا طالب ہوتا ہے اور یہ طلب کسی بھی حد تک پہنچ کر ختم نہیں ہوتی گویا حرص نفس کی اس نہ ختم ہونے والی طلب کا نام ہے جس کا مطلوب عموماً دنیاوی ہوتا ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ حرص دراصل صبر، شکر، قناعت، توکل وغیرہ کی براہِ راست ضد ہے۔ ظاہر ہے ایسی صفات سے متصادم ہونے والی چیز بہت گہرا روحانی اور اخلاقی ضرر رکھتی ہے۔

س: اس ضرر کی کچھ تفصیل بتا دی جائے؟

ج: ۱۔ حرص عموماً دنیا اور مال کی محبت سے پیدا ہوتی ہے اور اس محبت میں بے انتہا اضافے کا سبب بنتی ہے۔ گویا حرص کا پہلا ضرر تو یہ ہوا کہ یہ پہلے سے موجود ایک برائی میں شدت اور وسعت پیدا کرتی ہے۔

۲۔ اس سے تعلق باللہ اپنی بنیاد میں کمزور پڑ جاتا ہے۔ اوپر ہم نے ان روحانی و اخلاقی فضائل کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی یہ براہِ راست ضد ہے۔ غور کیجیے تو یہ تمام فضائل یعنی صبر، شکر، قناعت، توکل وغیرہ بندے اور رب کے تعلق میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے خالی ہو کر آدمی بندگی کے احساس اور ربوبیت کے ادراک سے بڑی حد تک محروم ہو جاتا ہے۔

۳۔ یہ دین کے بنیادی تقاضے یعنی اللہ کے لیے پسندیدگی و ناپسندیدگی سے منہ موڑنے کا نام ہے۔ عام طور پر حرص کا موضوع وہ چیزیں ہیں جو دین میں یا تو مطلوب ہی نہیں ہیں یا اگر مطلوب ہیں بھی تو بعض قطعی حدود و شرائط کے ساتھ مثلاً روٹی کپڑا مطلوب ہے لیکن ان کی طلب شریعت کی بتائی ہوئی حدود کے اندر ہونی

چاہیے۔حرص میں آدمی اپنی ضرورت کو حد جواز میں نہیں رکھتا بلکہ اس سے تجاوز کر جاتا ہے۔

۴۔ اس کا بہت بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ حریص شخص زندگی کے اس سانچے ہی کو توڑ دیتا ہے جو قرآن وسنت نے بنایا ہے۔یہ انتہائی خطرناک بات ہے کیونکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آدمی کا ذوق دین سے ادنیٰ درجے میں بھی ہم آہنگ نہیں رہا۔

۵۔ حرص سے ذہن اور طبیعت میں ایسی کجی پیدا ہو جاتی ہے جو آدمی کو اللہ کے احکام میں تحریف پر مجبور کرتی ہے بلکہ ان کے انکار تک پہنچا دیتی ہے۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ تمام دینی احکام کی بنیاد گویا اس حکم پر ہے کہ اللہ کے آگے تمہارا نفس اور آخرت کے سامنے دنیا کوئی چیز نہیں۔حرص اس بنیادی ترین حکم میں یا تو تحریف کرواتی ہے یا اس کا منکر بنا دیتی ہے۔

۶۔ بندہ تقدیر پر راضی نہیں رہتا جو ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔

۷۔ حریص آدمی دین کا ایک نہایت بنیادی مطالبہ پورا کرنے کے قابل نہیں رہتا اور وہ ہے اللہ کے راستے میں ہر طرح کے ایثار کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا۔

س: ان نقصانات کے بیان سے ذہن میں بخل کا تصور بھی آتا ہے۔آیا بخل اور حرص میں کوئی ایسی مشابہت ہے کہ کہیں کہیں ان سے پہنچنے والا نقصان بھی ایک ہو جاتا ہے؟

ج: یہ بالکل درست ہے۔حرص کے سلسلے میں ہم نے جو آخری نقصان بتایا ہے وہ بخل سے بھی متعلق ہے۔حرص اور بخل ظاہر میں مختلف لیکن حقیقت میں تقریباً ایک ہیں اور یوں سمجھیں کہ دنیا کی محبت ان کی ماں ہے۔

س: حرص کے علاج کی تدابیر کیا ہیں؟

ج: حرص سے بچنے کے لیے وہی تدابیر کارگر ہیں جو حبّ دنیا کے علاج میں بتائی جا چکی ہیں۔ اصولی طور پر حرص کا تدارک متواتر انفاق سے کرنا چاہیے۔ یہی بخل کا علاج بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ موت کا تصور بھی ایسی تاثیر رکھتا ہے جس سے حرص کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ نیز نفلی روزوں کی مدد بھی لی جا سکتی ہے کیونکہ روزہ نفس میں اور جسم میں اضمحلال پیدا کرتا ہے۔ حرص کے ازالے کے لیے یہ اضمحلال مفید ہے۔

مختصراً یہ کہ اگر آدمی اس فیصلے پر عمل کرنے کی قدرت پیدا کر لے کہ میری دنیا اللہ کے بندوں کے لیے ہے اور خود مَیں اور میرا وقت اللہ کے لیے تو اس طرح گویا اس کے ہاتھ میں کلہاڑا آ جائے گا جو حرص کی جڑ پر بھی چلایا جا سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ اس اصول کو نفس پر ہمہ وقت وارد رکھا جائے کیونکہ یہ نفس کی مجموعی امارگی کے علاج کا اسلوب ہے۔

دین نے ہماری دنیاوی زندگی کے لیے چند مقاصد متعین کر رکھے ہیں۔ ان مقاصد کا شعور حرص کے علاج میں مدد دے سکتا ہے تاہم یہ شعور قانون کی بجائے اسلامی زندگی کے بڑے نمونوں سے اخذ کرنا زیادہ موثر ہوگا۔ مطلب یہ کہ اس طرح کی خرابیوں میں محض یہ بتا دینا کافی نہیں کہ اللہ کو توکل مطلوب ہے، صبر مطلوب ہے وغیرہ بلکہ توکل اور صبر وغیرہ کی مثالیں رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی سے واقعاتی انداز میں لانی چاہئیں۔ اس میں کشش زیادہ ہے جو تاثیر میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

س: حرص کو آپ نے منفی معنوں میں استعمال کیا ہے جبکہ یہ لفظ مثبت معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے؟

ج: یہ سوال نظری تو ہے عملی نہیں کیونکہ حرص ہمارے روزمرہ میں منفی معنوں ہی میں آتا ہے سو ہم نے اسی کی پیروی کی ہے۔

قساوتِ قلبی

حکم ربّانی

—﴿ قَدْاَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِہِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾

(المومنون:۲۳:۱،۲)

—وہ ایمان والے یقیناً فلاح پائیں گے جو اپنی نماز خشوع کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

—﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾(الشعراء:۲۶:۲۱۵)

اوران لوگوں پرشفقت کا ہاتھ رکھیں،جنہوں نے ایمان لاکرآپ کی پیروی اختیارکرلی ہے۔

فرمان نبوی

—''عن أنس رضي الله عنه ، قال: خَطَبَنَارسولُ الله ﷺ ، خُطْبَةً ما سَمِعْتُ مِثْلَهَا قَطُّ، فقال: لَوْتَعْلَمُوْنَ مَاأَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًاوَلَبَکَیْتُمْ کَثِیْراً، فَغَطّٰی اَصْحَابُ رَسولِ اللّٰهِ ﷺ وُجُوْهَهُمْ، وَلَهُمْ خَنِینٌ۔''(۱)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں (ایک مرتبہ)ایسا خطبہ ارشادفرمایا کہ اس جیسا خطبہ میں نے کبھی نہیں سنا،آپ ﷺ نے فرمایا،اگرتم وہ باتیں جان لوجن کا مجھے علم ہے توتم ہنسوتھوڑااورروؤزیادہ۔پس رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ نے اپنے چہرے ڈھانپ لئے اوران کی آہ وزاری کی آوازیں آرہی تھیں۔

—''ابعدالناس من اللّٰه القلب القاسی''(۲)

لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ دورسخت دل (والاآدمی) ہے۔

---

(۱)صحیح بخاری،کتاب الرقاق،باب قول النبی ﷺ لوتعلمون مااعلم لضحکتم قلیلاولبکیتم کثیرا

(۲)سنن الترمذی،ابواب الزہد،باب ابعدالناس من اللہ القلب القاسی

س: قساوتِ قلبی کیا ہے؟

ج: قلب میں دو چیزیں از روئے دین مطلوب ہیں:

۱۔ اللہ کے آگے تذلل اور رقت: جس کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ بندہ عبادت کے موقع پر اپنی بندگی کو محسوس کرنے کے قابل ہو۔

۲۔ مخلوق کے لیے شفقت: جس کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی لوگوں کا، خواہ ذہنی سطح پر ہی سہی، خیر خواہ ہو اور طبیعت پر جبر کر کے بھی ان کے فائدے کے کوئی کام کر سکے۔

ان دونوں علامتوں میں سے کوئی بھی علامت کمزور یا غائب ہو تو دین داری پر زد پڑے گی۔ قساوتِ قلبی ان دونوں اوصاف کے فقدان سے عبارت ہے۔ طبیعت کی سختی وغیرہ ضروری نہیں کہ قساوتِ قلبی کی وجہ سے ہو۔ قساوتِ قلبی سختی نہیں بلکہ سفاکی ہے اور وہ بھی مدلل یعنی قاسی القلب شخص اپنی قساوت کے حق میں دلائل بھی رکھتا ہے۔

س: گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ قساوتِ قلبی میں ایک طرف وہ تذلل اور رقت غائب ہو جاتی ہے جس کے بغیر بندگی بے معنی ہے اور دوسری طرف وہ بے رحمی اور سنگدلی سر اٹھا لیتی ہے جس کی موجودگی میں آدمی دوسروں کا دکھ درد بٹانا تو کجا اسے بڑھانے کا سبب بن جاتا ہے، کیا ہمارا یہ تاثر ٹھیک ہے؟

ج: بالکل صحیح۔ قساوتِ دل کے دونوں دروازوں کے بند ہو جانے کا نام ہے یعنی جو دروازہ اللہ کی طرف کھلتا ہے وہ بھی بند ہو جاتا ہے اور جو مخلوق کی طرف کھلتا ہے، وہ بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ قساوت میں مبتلا شخص اپنی اس حالت کو اچھی حالت سمجھتا ہے۔

س: ابھی آپ نے یہ فرمایا کہ طبیعت کی سختی قساوتِ قلبی نہیں ہوتی، یہ بات سمجھ میں نہیں

آئی؟ کیونکہ عام طور پر قساوت قلبی اور طبیعت کی سختی کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے؟

ج: یہ اچھا سوال ہے۔ ہماری رائے میں طبیعت کی سختی دو طرح کی ہوتی ہے۔ایک وہ جو قساوت قلبی کا نتیجہ ہے اور دوسرے وہ جو آدمی کی افتادِ طبع، ماحول، تجربات وغیرہ کی دین ہے۔اس دوسری قسم پر کوئی اخلاقی حکم وارد نہیں ہوتا۔طبیعت کی نرمی یا سختی، دونوں کا اخلاقی مرتبہ اس بات سے متعین ہوگا کہ ان کا مرکز اور مصرف کیا ہے؟ یہ اپنی جگہ محض ان قوتوں کی طرح ہیں جن کا صحیح استعمال بھی ممکن ہے اور غلط بھی مثلاً طبیعت کی نرمی کا صحیح استعمال اللہ کی یاد اور مخلوق پر شفقت ہے لیکن اس سے بے حمیتی اور عدم صلابت بھی برآمد ہو سکتی ہے۔دوسری طرف طبیعت کی سختی کا بھی یہی حال ہے کہ اسے اللہ کی راہ میں استعمال کر کے ایک مجاہدانہ کردار بھی پیدا کیا جا سکتا ہے اور دین سے منحرف ہونے کی طاقت بھی بنایا جا سکتا ہے۔قساوت قلبی کا یہ معاملہ نہیں ہے کیونکہ اس کا کوئی بھی مثبت پہلو نہیں ہے۔

س: بعض لوگ دین کے نام پر ایک جارحانہ اور متشددانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ بتایا جائے کہ کیا اس رویے کے پیچھے بھی کسی درجے میں قلب کی قساوت کارفرما ہوتی ہے؟

ج: یہ ایک برمحل لیکن مشکل سوال ہے۔عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی دانست میں دین کی اسی تعبیر یا صورت کو حق سمجھتا ہو جو اس کے پاس ہے اور دوسروں کو جو اس کے ساتھ نہیں ہیں اپنا مخالف نہیں بلکہ دین کا مخالف جانتا ہو۔اس صورت میں اس شخص کو کچھ اور تو کہا جا سکتا ہے لیکن شقی القلب نہیں کہا جا سکتا۔تاہم ہمارے یہاں جو گروہی تعصب بہت شدت سے موجود ہے وہ بڑی حد تک قساوت قلبی کا مظہر ہے۔جب ہم گروہی تعصب کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے انسانی رائے کو اللہ

کے حکم کی جگہ دے کر اس رائے کے مخالفین کے بارے میں ایسے خیالات و جذبات رکھنا جیسے کافروں کے ساتھ رکھے جاتے ہیں اور پھر ان جذبات و خیالات کو عملی شکل دینے کی کوشش کرنا...... بدقسمتی سے اس معنی میں بھی گروہی تعصب امت میں شدت سے موجود ہے اور اس کو ہوا دینے کا ماحول بھی رفتہ رفتہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری منفی چیزیں اسلام کے مقصودِ اصلی کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں۔ مسلمان جب اللہ کی توحید اور ختم نبوت کا اقرار کرتا ہے تو وہ بعض فرائض کا تہذیبی و اخلاقی سطح پر بھی پابند ہو جاتا ہے۔ محض اللہ کو ایک مان لینے اور رسول اکرم ﷺ کو آخری نبی تسلیم کر لینے سے عقیدۂ توحید و رسالت کے تمام تقاضے پورے نہیں ہو جاتے۔

توحید پر حقیقی ایمان کا یہ بھی تقاضا ہے کہ مسلمان چند مستقل بنیادوں پر ایک ہو جائیں اور اس کے بعد کوئی دینی یا دنیاوی اختلاف اس وحدت کو متاثر نہ کر سکے۔ اسی طرح ختم نبوت کا بھی ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم رسول کریم ﷺ کی حتمی اور عالمگیر حجیت کو اپنی آفاقی وحدت کی بنیاد بنائیں۔ اس سے نیچے اتر کر گروہی وحدتوں کی تشکیل، جو حق و باطل کا مدار بن جائے، محض غلط ہی نہیں بلکہ ایک لحاظ سے ختم نبوت کا انکار ہے۔

مسلمان کے لیے غلط تعبیرات میں بھی پہلی اور آخری سند قرآن و سنت ہی کو ہونا چاہیے۔ ہمارے لیے دین میں غلطی کا بس ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ وہ قرآن و سنت کے محکمات کے خلاف ہو اور اسی طرح دینی صحت کا بھی یہی واحد ثبوت ہے کہ وہ قرآن و سنت کے محکمات کے مطابق ہو۔ اس دائرے سے باہر ہر اتفاق و اختلاف یا ہر صحیح و غلط قیاسی ہے اور قیاس کی بنیاد پر حاصل ہونے والے نتائج کو معیارِ حق و باطل بنا دینا اتنی بڑی غلطی ہے کہ اس کے مضمرات کا پوری طرح اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔

بہر حال قساوت قلبی کی ایک نحوست تو اوپر بیان ہوگئی کہ یہ دینی مقاصد سے

متصادم ہے۔ دوسرا ضرر یہ ہے، جو انفرادی سطح پر ہے، کہ اس تعصب میں مبتلا کوئی بھی شخص سنگ دلی سے محفوظ نہیں رہ سکتا، چاہے وہ اپنی تعبیرِ دین میں ٹھیک ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے مظاہر ہم ماضی میں بھی دیکھتے رہے ہیں اور آج بھی دیکھ رہے ہیں کہ گروہی نفسیات میں در آنے والا تشدد اپنے مخالفین کو کافرِ مطلق سے کم کا درجہ دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ غور کریں تو یہ بات واضح طور پر محسوس ہو جائے گی کہ مسلمان کی ناحق تکفیر محض دماغ کی خرابی ہی نہیں بلکہ قساوتِ قلبی کا بھی نتیجہ ہے کیونکہ تکفیر سے بڑھ کر کوئی چیز مسلمان کو ایذا نہیں پہنچا سکتی۔ یہ بات تکفیر کرنے والا بھی جانتا ہے اور اس کے باوجود یہ حرکت کرتا ہے تو لامحالہ یہ بدترین قسم کی ایذا رسانی ہوئی جس کا ارتکاب کوئی شقی القلب ہی کر سکتا ہے۔

س: قساوتِ قلبی کا علاج کیا ہے؟

ج: یہ اتنی بڑی خرابی ہے کہ اس کے علاج کے لیے سچ پوچھیں تو کچھ متنازعہ طریقے بھی استعمال کر لیے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں مثلاً صوفیوں کے بعض حلقوں میں مروج سماع اس کے علاج میں موثر ہے۔ گو کہ ہم سماع کو جائز نہیں سمجھتے لیکن مرض کی شدت کو دیکھتے ہوئے اس کو بطور علاج تجویز کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس خرابی کا علاج ہی سماع سے شروع کیا جائے بلکہ ہم صرف یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہیں کہ اس سطح کے مہلک امراض سے نمٹنے کے لیے کچھ خلافِ احتیاط تدابیر بھی، بشرطیکہ وہ صریحاً حرام نہ ہوں، اختیار کی جا سکتی ہیں۔

مندرجہ ذیل چیزوں پر عمل کر کے بھی اس خرابی پر قابو پایا جا سکتا ہے:

۱۔ اچھی آواز اور اچھے لحن کے ساتھ قرأت سننا یا نعتیں اور ایسا کلام سننا جو شرعی اعتبار سے مخدوش نہ ہو۔

۲۔ تنہائی سے بچنا اور بے تکلف دوستوں کی صحبت اختیار کرنا۔

۳۔ وقتی طور پر مشقت والی نفلی عبادات ترک کر دینا۔

۴۔ صوفیا کے طریقے پر بلند آواز سے ذکر کرنا۔

۵۔ اپنے وقت کا کچھ حصہ چھوٹے بچوں (اطفال) کے ساتھ گزارنا۔

۶۔ تکلف اور مبالغے کے ساتھ اپنے سے بڑوں کی خدمت کرنا۔

۷۔ بشرطِ ضرورت کسی معالج کے مشورے سے مفرح دوائیں استعمال کرنا۔

علاج کی یہ سب صورتیں ان شاء اللہ کسی نہ کسی درجے میں موثر ہیں لیکن ہماری ترجیح تلاوت سننا اور بے تکلف دوستوں کی صحبت اختیار کرنا ہے۔

۞۞۞

شهواتِ نفس

شکم پروری

حکم ربّانی

— ﴿ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴾

(الاعراف: ۷:۳۱)

کھاؤ اور پیو مگر حد سے نہ بڑھو کیونکہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

— ﴿ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ○ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ﴾ (الاسراء: ۱۷:۲۶،۲۷)

اپنا مال بے جا خرچ نہ کرو، بے جا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔

فرمان نبوی

— ''بحسب ابن آدم اکلات یقمن صلبه۔ فان کان لامحاله فثلث لطعامه وثلث لشرابه وثلث لنفسه''(۱)

آدمی کو سدِ رمق کے لئے چند لقمے بھی کافی ہیں اور اگر زیادہ ہی کھانے کو جی چاہے تو معدے کا ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس لینے کے لیے رکھے۔

— ''ان من السرف ان تاکل کلما اشتهیت''(۲)

یہ بھی اسراف ہے کہ آدمی کو جس وقت بھوک لگے اسی وقت کھانا کھالے۔

(۱) جامع الترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی کراھیة کثرة الأکل

(۲) سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمہ، باب من الاسراف ان تاکل کل مااشتھیت

س: شکم پروری سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: جسم کی جو ضرورتیں غذا سے پوری ہوتی ہیں ان ضرورتوں تک محدود رہے بغیر کھانے کی خواہش اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے عملی یا خیالی مشقت اٹھانا شکم پروری ہے۔ اس خرابی میں مبتلا آدمی پیٹ کی فرضی ضروریات کو دیگر حقیقی ضروریات پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ یہ شکم پروری کا ٹھیٹھ مفہوم ہے۔

شکم پروری کے کئی درجے ہیں:

۱۔ پیٹ بھر کر کھانا

۲۔ طرح طرح کے کھانوں کا شوق

۳۔ پیٹ بھر جانے کے باوجود کھانے کی رغبت کم نہ ہونا

۴۔ کھانے پر فضول خرچی

۵۔ کسی خاص قسم کے کھانے کے لیے خود کو تکلیف میں ڈالنا۔

انسانی جسم کی دو بنیادی ضرورتیں، قوت اور فرحت، غذا سے پوری ہوتی ہیں اور انہیں پورا ہونا چاہیے۔ اگر آدمی خود کو قوی اور ہلکا پھلکا رکھنے کے لیے کچھ غذائیں زیادہ یا کم مقدار میں مخصوص بھی کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس مقصد کے لیے اگر کچھ اہتمام بھی کرنا پڑے تو کر لینا چاہیے۔ ٹھیٹھ دینی نقطۂ نظر سے جسم کی قوت ضروری اعمال کے لیے اور فرحت، شکر گزاری اور خوش اخلاقی کے لیے لازمی ہے۔ گویا سچا مسلمان غذا کو بھی اپنی بندگی کا معیار بڑھانے کے لیے استعمال کرتا ہے لیکن اگر کوئی شخص جسمانی ضرر، مالی نقصان، بدتہذیبی وغیرہ کو قبول کر کے محض اپنے پسندیدہ ذائقوں کی پیروی کرتا ہے تو یہ یقیناً شکم پروری ہے اور قطعاً ناجائز ہے۔ ایسا آدمی جسم کی ضرورتوں کو بھی فوت کر دیتا ہے، یعنی بسیار خوری کی وجہ سے طرح طرح کے امراض اور طبیعت کی کسل مندی میں مبتلا ہو جاتا ہے

اور دوسری طرف خود کو نفس کے قابو میں دینے کا سامان بھی کر لیتا ہے یعنی دنیاوی زندگی میں ایک سچے اور شکر گزار بندے کا کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا اور دین اس کی زندگی میں ترک لذات کا جو مطالبہ سامنے رکھتا ہے اس کی تکمیل کی طاقت اور خواہش سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ دین روحانیت کو جسمانیت پر غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ کھانے پینے کی طرف غیر معتدل میلان رکھنے والا آدمی اس حکم کو نہ صرف یہ کہ پورا نہیں کرتا بلکہ اپنے ذوق اور عمل سے اس کے انکار تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ شکم پروری کا وہ نقصان ہے جو انسان کے پورے دینی وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

س: گو کہ اس عادت کے بنیادی نقصانات اوپر کی گفتگو میں آ گئے ہیں تاہم بہتر ہوگا اگر ان کی ایک فہرست بھی بنا دی جائے؟

ج: ۱۔ کسل: (اس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے)

۲۔ عبادات سے جو روحانی اطمینان اور کشادگی حاصل ہوتی ہے اس عادت میں پڑ کر آدمی اس سے محروم ہو جاتا ہے۔

۳۔ حرص

۴۔ بے حمیتی اور بے شرمی: دعوت وغیرہ کے موقع پر کھانوں کی طرف بے تابی سے لپکنا غیرت اور وقار کے خلاف ہے اور شکم پرور آدمی اس سے بچ نہیں سکتا۔

۵۔ دنیا سے محبت اور اس میں غیر معتدل شخصیت: اس کا دینی ضرر اگر بتانا ہو تو یہ کہنا کافی ہوگا کہ یہ چیز پورے دین کی روح سے متصادم ہے۔

۶۔ خود غرضی

۷۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے عدم مناسبت اور بے رغبتی۔

۸۔ مختلف جسمانی عوارض

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا مستقل علاج جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے ثابت ہے یہ ہے کہ آدمی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھائے (۱) اور معدے کا ایک تہائی حصہ خالی رکھنے کی عادت ڈالے (۲) اس کے علاوہ کوئی علاج موثر نہیں ہو سکتا۔ اس علاج پر کاربند ہونے کے لیے چند تدابیر، البتہ اختیار کی جا سکتی ہیں مثلاً:

۱۔ کچھ مدت تک ایسی غذاؤں پر اکتفار کرنا جو طبعاً مرغوب نہ ہوں۔

۲۔ محنت والے کام کرنا خصوصاً کسی ایک عبادت میں اپنے آپ کو تھکانا۔

۳۔ تنہا کھانے سے گریز کرنا

۴۔ ایک وقت میں ایک ہی سالن تک محدود رہنا

۵۔ ہر نوالے پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنا

۶۔ کھانے سے پہلے ایک آدھ گلاس پانی پی لینا

۷۔ اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے کچھ خیرات کرنا

۸۔ لوگوں کو کھانا کھلانا

۹۔ دن میں ایک وقت کھانے کی عادت ڈالنا اور اس میں بھی پیٹ بھر کر نہ کھانا۔

۱۔ جامع الترمذی، کتاب الاطعمہ، باب ماجاء ان المومن یأکل فی معی واحد

۲۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمہ، باب الاقتصاد فی الأکل و کراھة الشبع۔

جنس پرستی

حکم ربانی

—﴿وَلَاتَقْرَبُوْاالزِّنٰی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِیْلًا﴾(الاسراء۱۷:۳۲)

اور زنا کے قریب نہ جاؤ، وہ بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔

—﴿وَاَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِالْقُلُوْبُ لَدَی الْحَنَاجِرِ کَاظِمِیْنَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ o یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَاتُخْفِی الصُّدُوْرُ﴾ (المؤمن:۴۰:۱۸،۱۹)

اور آپؐ ان لوگوں کو قریب آنے والی مصیبت کے دن سے خبردار کر دیں جب کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے لوگ غم سے بھرے ہوئے ہوں گے، اس دن ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات مانی جائے، (اور قیامت کے دن وہ ان کا حساب لے گا۔) یقیناً اللہ نگاہوں کی چوری کو جانتا ہے اور سینوں کے چھپے رازوں کو بھی۔

فرمان نبوی

—"لاینظر الرجل إلی عورة الرجل ولاامرأة إلی عورة المرأة ولا یفضی الرجل إلی الرجل فی ثوب واحد، ولاتفضی المرأة إلی المرأة فی الثوب الواحد۔"(۱)

مرد کو چاہیے کہ وہ کسی مرد کی شرمگاہ پر نظر نہ ڈالے اور نہ عورت کو چاہیے کہ کسی عورت کی شرمگاہ کو دیکھے۔ اسی طرح نہ دو مردوں کو ایک کپڑے میں اکٹھے لیٹنا چاہیے اور نہ عورتوں کو۔

—"العینان زناهما النظر، والاذنان زناهما الاستماع، واللسان زناه

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب تحریم النظر الی العورات

الکلام، والید زناھا البطش، والرجل زناھاالخطا،والقلب یھوی ویتمنی......''(۱)

آنکھوں کا زنا (حرام) دیکھنا ہے، کانوں کا زنا (حرام) سننا ہے،زبان کا زنا (حرام) بولنا ہے،ہاتھوں کا زنا (حرام) حرکت کرنا ہے،ٹانگوں کا زنا (حرام) کی خاطر چلنا ہےاوردل کا زنا (حرام) کی تمنااورخواہش کرنا ہے۔

س: جنس پرستی سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: جنسی قوت کا غیر معتدل استعمال اور جنسی خیالات کا غلبہ جنس پرستی ہے۔

س: اس کے کچھ مظاہر بتا دیے جائیں تو سمجھنے میں سہولت رہے گی؟

ج: ۱۔زنا۔ ۲۔لواطت ۳۔استمنا بالید ۴۔کثرتِ جماع

۵۔ جنسی لذات کے تصور میں کھوئے رہنا۔

س: اس کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: اس کے نقصانات کو تین اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے: دینی نقصانات،نفسیاتی نقصانات اور طبی نقصانات۔

۱۔ دینی نقصانات

اس کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ آخرت میں پکڑ تو واضح ہے اس کے علاوہ آدمی کا دینی وجود بڑی حد تک جنسی داعیے پر قابو رکھنے سے تقویت پاتا ہے۔ اگر آدمی اس داعیے سے مغلوب ہو جائے تو اس کی شخصیت میں دینی رنگ ادنیٰ درجے میں بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ جنس کا غلبہ اس بنیادی لطافت،قوت، اخلاص اور مجاہدے کے خلاف ہے جس کے بغیر آدمی کا دین ایک بے روح جسد بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ خرابی روح کو ناپاک کر دیتی ہے جس کے بعد دینی اعمال و تصورات کے کوئی حقیقی معنی نہیں رہتے۔

---

(۱) مسند احمد بن حنبل، ۱:۴۱۲

۲۔ نفسیاتی نقصانات

صحت مند نفسیات کا اصول یہ ہے کہ وہ فطرت سے ہم آہنگ ہو۔ فطرت کا مطلب ہے وہ اصلِ تخلیق جو خیر، حق اور جمال پر مبنی ہے اور دین ہمیں اسی پر قائم رکھنے یا کرنے کے لیے آیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیں کہ جنسی غلبے کا منبع بہیمیت ہے جو انسانیت کی سب سے واضح ضد ہے۔ گو کہ بہیمیت انسانی وجود کے قانون کو قبول کر کے اس کے ایک معاون جزو کے طور پر بنیادی قوت حیات اور بعض مطلوب نفسی طاقتوں کا سرچشمہ ہے لیکن اگر یہ بہیمیت، جو انسانی نفس کی جبلی سطح پر کارفرما ہوتی ہے، اپنی حد سے تجاوز کر کے انسانی وجود کے ذہنی اور روحانی مراتب کے تابع نہ رہے اور زندگی کے ان مقاصد کو قبول نہ کرے جن کی طرف پیش قدمی کرتے رہنا انسان ہونے کی واحد شرط ہے، تو یہ انسان کے باطنی سانچے کو ناقابلِ اصلاح حد تک متاثر کر سکتی ہے۔ اس کا غلبہ نفس کی انسانی ساخت کو مسخ کر دیتا ہے اور اسے ایک ایسے انتشار میں پھینک دیتا ہے جہاں وابستگی کا کوئی روحانی محرک اور سبب باقی نہیں رہتا۔ اس بات کو آسان کر کے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ انسانی نفس باعتبارِ ماہیت اصول وابستگی اور اس کے شعور پر قائم ہے۔ اس اصول میں کوئی رخنہ یا خلفشار پیدا ہو جائے تو نفس گویا انسانی تشخص سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ محض ایک نفسیاتی خرابی ہی نہیں بلکہ تمام متصورہ خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس ہمہ گیر خلل کے یوں تو بہت سے مظاہر ہیں تاہم یہاں ہم ان میں سے چند ایک کی نشان دہی مناسب سمجھتے ہیں:

۱۔ ذہن کا صورت تک محدود رہ جانا اور معنی تک رسائی کے قابل نہ رہنا۔ آدمی کی تین چوتھائی نفسیات صرف اس خرابی کی وجہ سے غارت ہو جاتی ہے۔

۲۔ حسِ جمال کا مسخ ہو جانا۔ جسمانیت پر اصرار اس کا سب سے بڑا سبب ہے اور جنس زدگی جسمانیت پر اصرار ہی کا نام ہے۔

۳۔ وہ کیفیات جو انسانی کردار کے بالاتر معاملات سے وابستہ ہیں، جنس زدہ آدمی ان

کے تجربے سے محروم رہ جاتا ہے۔

۴۔ جنسی لحاظ سے مغلوب شخص دکھ سکھ کی روحانی معنویت سے عاری ہو جاتا ہے۔

۵۔ اس کا تخیل حق، خیر اور جمال سے مناسبت قائم رکھنے یا پیدا کرنے کے لائق نہیں رہتا۔

۶۔ نفس نے بعض رشتوں کے حوالے سے خود پر کچھ پابندیاں فطری طور پر عائد کر رکھی ہوتی ہیں، جنس زدگی ان پابندیوں کو توڑ دیتی ہے اور یہ بدنصیب آدمی، اور تو اور، اپنی ماں بہنوں تک کے تصور میں اس کی آمیزش کر لیتا ہے۔ یہ ارادی ہو تو بے حمیتی ہے اور غیر ارادی ہو تو عذاب۔

۳۔ طبّی نقصانات

مختلف جسمانی عوارض مثلاً جنسی بیماریاں، جسمانی و اعصابی کمزوری، سوءِ ہضم، اندھاپن......اور دیگر معروف امراض جن کی تفصیل کسی بھی طبّی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: غلبۂ شہوت کے عموماً تین اسباب ہوا کرتے ہیں: نفس اور ذہن کا بگاڑ، ضعفِ باہ اور جنسی قوت کی غیر متوازن کارفرمائی۔

نفس یا ذہن کے بگاڑ کی صورت میں علاج یہ ہے کہ دو طرح کی مصروفیات پیدا کی جائیں: ایک خالص علمی اور دوسرے تفریحی۔ علمی مشغولیت سے ذہن میں جھوٹی لذتیں حاصل کرنے یا انہیں ایجاد کرنے کے داعیہ کمزور پڑ جائے گا اور زندگی میں دلچسپی کے قابل گہرائیاں اور بلندیاں نظر آنے لگیں گی۔ تفریحی سرگرمیوں سے نفس کسی جھوٹی فرحت میں مبتلا ہونے سے بچ جاتا ہے اور ایک مفید، مثبت اور اپنی ماہیت میں قدرے مختلف نشاط کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے۔ گویا ذہن کو علم کی

طرف مائل کر کے وہ وقار اور خشکی حاصل ہوتی ہے جو غلبۂ شہوت کے ازالے کا کام دے سکتی ہے جبکہ تفریحات سے اس کا متبادل دریافت ہو جاتا ہے۔

۲۔ ضعفِ باہ کی صورت میں کسی نفسیات دان معالج سے رجوع کیا جائے۔ اتنا یاد رہے کہ غلبۂ شہوت اکثر جنسی کمزوری ہی سے لاحق ہوتا ہے۔ اس خرابی میں مبتلا شخص اپنی جنسی صلاحیت کو بار بار چیک یا ٹیسٹ کرنا چاہتا ہے۔ یہی رجحان شہوت کو مختلف صورتوں میں غالب ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

۳۔ جنسی قوت کا غیر متوازن ہونا: بعض لوگوں میں قوائے احساس اور قوائے ذہنی کی نشو و نما نارمل طریقے سے نہیں ہو پاتی۔ ان میں اگر کوئی چیز پروان چڑھتی ہے تو وہ جبلت کی سطح کی ہوتی ہے۔ ذہن اور دوسرے احساسات کی پسماندگی اور محض جبلی قوتوں کی نشو و نما سے جنس کی قوت اور تصور ایک غیر متوازن صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ ایسا آدمی ذہن و حواس کے ہر عمل میں اور زندگی کے تمام مظاہر میں جنسی معنی یا کیفیت ڈھونڈنے کا عادی بن جاتا ہے۔ جنس پر ایسا ارتکاز جنس کی صلاحیت میں ایک غیر انسانی پن اور حیوانیت پیدا کر دیتا ہے جسے یہ آدمی اپنے لیے باعث فخر بنا کر اسے استعمال کرنے کی ہر ممکن صورت نکالتا رہتا ہے۔ ایسا مریض اپنے آپ کو کسی بھی پہلو سے قابلِ علاج نہیں سمجھتا بلکہ اس کے برعکس وہ خود کو مردانگی کے سمبل کے طور پر دیکھتا ہے اور دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کے معالجے میں کسی ماہرِ نفسیات کی مدد لینا ناگزیر ہے۔

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ یہ خرابی اگر اپنی بنیاد میں ٹھیک ہو سکتی ہے تو صرف دینی زندگی اختیار کرنے سے ہو سکتی ہے۔ دینی زندگی یعنی اپنی بندگی کو عاجزی کے ساتھ یاد رکھنا اور دین کے مطلوبہ نفسیاتی فضائل (یعنی انکسار، روحانیت اور بلند مقاصد) کو حاصل کرنے کی امنگ آدمی کو جبلت اور جسمانیت کا اسیر ہونے سے مکمل طور پر محفوظ رکھتی ہے

بلکہ غلبۂ شہوت ہو یا نفس کے بگاڑ کی کوئی اور صورت، اس کے علاج کی حتمی صورت یہی ہے جو ہم نے عرض کر دی۔ پہلے دینی زندگی گزارنے کا عزم کیا جائے پھر بعض دینی اعمال کو اس کے علاج کے لیے استعمال کیا جائے تو اس خرابی کا مکمل ازالہ ہو سکتا ہے۔ وہ اعمال جو غلبۂ شہوت کو معتدل کرتے ہیں یہ ہیں:

۱۔ روزہ، جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔(۱)

۲۔ ترجمے کے ساتھ قرآن کی تلاوت

۳۔ کثرتِ استغفار

۴۔ ''سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم'' کی اہتمام کے ساتھ تکرار۔ اہتمام سے مراد یہ ہے کہ دل اور زبان کو ہم آہنگ کر لیا جائے۔

۵۔ احوالِ آخرت کا کوئی پُر اثر بیان منتخب کر کے اس کا بار بار مطالعہ کیا جائے۔

۶۔ نیک لوگوں کی صحبت

۷۔ نامحرم عورتوں اور کم عمر لڑکوں سے نہ صرف یہ کہ نظر کی احتیاط کی جائے بلکہ ان سے رابطے کے ہر دروازے کو بند رکھا جائے۔

۸۔ ہر وقت باوضو رہنے کی عادت ڈالی جائے۔

۹۔ قرآن شریف کا کوئی چرمی نسخہ جیب میں رکھا جائے اور موقع ملنے پر ادھر ادھر سے اس کی تلاوت بھی کی جائے۔

۱۰۔ بالغ ہونے پر نکاح میں تاخیر نہ کرنا (جس کے لیے حضرت عمرؓ نے خصوصی احکام جاری کیے تھے۔(۲)

۱۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح

۲۔ سنن ترمذی، کتاب النکاح، باب ماجاء فی مہور النساء

بعض معاشرتی خرابیاں

اس عنوان سے ان خرابیوں کی نشاندہی مقصود ہے جن پر عمومی اور کلی انداز سے کوئی شرعی حکم لگانا ممکن نہیں تاہم نفسیاتی اور معاشرتی سطح پر ان کے مضر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ یہ ایسے نقائص ہیں جن کی موجودگی میں شخصیت کی تکمیل کا عمل مثبت انداز میں پورا نہیں ہوتا۔ ان کا ہونا اگر گناہ نہ ہو تو بھی بعض فضائل سے محرومی کا سبب بن سکتا ہے۔ یہاں ہم مندرجہ ذیل خرابیوں پر روشنی ڈالیں گے:

۱۔ سخت مزاجی

۲۔ بے مروتی

۳۔ بیوی بچوں کے ساتھ سختی

۴۔ بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دینا

۵۔ رسوم ورواج کی بے جا پابندی

۶۔ کام چوری

سخت مزاجی

حکم ربانی

—﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾

(آل عمران ۳: ۱۵۹)

اگر آپؐ تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپؐ کے پاس سے چھٹ جاتے۔

—﴿وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌo وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍo﴾ (فصلت ۴۱: ۳۴، ۳۵)

اور دیکھو بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ تم برائی کا جواب بھی بھلائی سے دو، پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس شخص میں دشمنی تھی وہ گویا تمہارا جگری دوست بن گیا ہے۔ اور یہ صفت انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرنے والے اور خوش نصیب ہوتے ہیں۔

فرمان نبوی

—''انّ شر الناس منزلة عندالله يوم القيامة من ودعه أوتركه الناس لاتقاء فحشه''(۱)

اللہ کے نزدیک درجے کے لحاظ سے بدترین آدمی قیامت کے دن وہ ہوگا جس کی زبان اور سخت کلامی کے ڈر سے لوگ اس کو چھوڑ دیں (یعنی اس سے ملنے اور بات کرنے سے گریز کریں)

—''ان الله رفيق يحب الرفق فى الأمر كله''(۲)

اللہ تعالیٰ خود بھی نرم ہیں اور ہر معاملے میں نرمی ہی کو پسند کرتے ہیں۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب السرّ، باب مداراة من يتقى فحشه

(۲) صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء للمشرکین

بعض لوگ مزاجاً روکھے اور سخت ہوتے ہیں ان کا طبعی میلان مردم بیزاری کی حد تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ ان میں سے وہ لوگ جو دوسروں کی دلآزاری اور تحقیر وغیرہ نہ کرتے ہوں، معذور ہیں۔ ایسی سخت مزاجی، جس کا سبب قساوت قلبی اور تکبر نہ ہو، عموماً چار اسباب سے پیدا ہوتی ہے:

۱۔ تربیت کا ابتدائی ماحول

۲۔ لوگوں سے دھوکہ کھانے کا کوئی تجربہ

۳۔ طبیعت میں جھجک اور خود اعتمادی کی کمی

۴۔ دینی شخصیت کے بارے میں بعض بنیادی تصورات کی غلطی

۱۔ تربیت کا ابتدائی ماحول: بچپن میں گھر اور سکول وغیرہ کا ماحول سخت گیری پر مبنی ہو تو سخت مزاجی رفتہ رفتہ طبیعت میں راسخ ہو جاتی ہے اور آدمی خود کو نہ صرف یہ کہ اس ماحول کا حصہ بنالیتا ہے بلکہ اس کا نمونہ بھی بن جاتا ہے۔

۲۔ لوگوں سے دھوکہ کھانے کا کوئی تجربہ: بعض افراد کی زندگی کا رنگ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ انہیں دوسروں کے منفی پہلوؤں ہی کا تجربہ ہوتا ہے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً کئی لوگوں پر اعتماد کر کے دھوکہ کھایا ہوتا ہے۔ ایک مرحلے پر پہنچ کر بے اعتمادی کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ یا تو ہر آدمی کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں یا پھر مردم بیزار ہو جاتے ہیں۔ سخت مزاجی اسی مردم بیزاری سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسا شخص یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے قریب ہو کر دوبارہ اس کا اعتماد حاصل کر لے اس لیے وہ خود کو ایک غیر مقبول اور ناگوار شخصیت میں ڈھال لیتا ہے تا کہ اسے دوبارہ ان تکلیفوں سے نہ گزرنا پڑے جو وہ ماضی میں اٹھاتا آیا ہے۔

۳۔ طبیعت میں جھجک اور خود اعتمادی کی کمی: سخت مزاج لوگوں کی اکثریت اسی سبب پر کھڑی ہے۔ ایسے لوگوں میں دو چیزیں بہت عام ہیں ایک تو یہ کہ وہ اپنے آپ سے بالکل

غیر مطمئن بلکہ بیزار ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ناکام ہونے سے اور اس سے بڑھ کر ناکام کہلانے سے ڈرتے ہیں۔ یہ کسی بھی صورت میں دوسروں پر اپنا اظہار نہیں چاہتے اور اس بات سے بھی بچنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کوئی ان سے توقعات اور امیدیں وابستہ کر لے کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت بہت حقیر اور مضحکہ خیز ہے نیز ان کے اندر وہ صلاحیت بھی مفقود ہے جس کی بنیاد پر دوسروں کے مطالبات اور معاشرتی ذمہ داریاں پوری کی جاسکیں۔ سخت مزاجی ایسے آدمی کے لیے وہ خول ہے جو اسے خود کو چھپانے میں مدد دیتا ہے۔

دینی شخصیت کے بارے میں بعض بنیادی تصورات کی غلطی: یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ دین دار لوگ، خصوصاً جو دین کے ظاہری مراسم پر زور دیتے ہیں، سخت مزاج اور بد خلق ہوتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کی اکثریت شقی القلب اور متکبر ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض افراد، جو عموماً اپنے طبقے کی صف اول میں نہیں ہوتے، چند غلط تصورات یا غلط فیصلوں کی وجہ سے ایک غیر متوازن شخصیت بن جاتے ہیں اور سخت مزاجی کو دین میں ترقی کا زینہ اور اپنی روحانی حفاظت کا ذریعہ سمجھ لیتے ہیں مثلاً زہد کا مطلب کج خلقی اور مردم بیزاری بن جاتا ہے اور دین پر استقامت کے ساتھ کاربند رہنے کا لازمی تقاضا ان لوگوں کی نظر میں پوری معاشرت سے منقطع ہوئے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے لوگ طبیعت اور ذہن کے سادہ ہوتے ہیں اور اس سادگی کی وجہ سے ہی اپنے اندر پیدا ہونے والی باتوں کو جانچنے کی کوشش نہیں کرتے اور سنے سنائے قصوں کی بنیاد پر اپنی دینی ترجیحات کو اٹل طریقے سے متعین کر کے بس ناک کی سیدھ میں چلتے جاتے ہیں۔ ان بیچاروں کو یقین ہوتا ہے کہ حقیقتاً دین دار وہ ہوتا ہے جو:

ا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی کسی بھی خلاف ورزی کو ہاتھ سے مٹانے پر مستعد رہے۔

۲۔ اپنے دینی معمولات میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔

۳۔ لوگوں سے میل جول نہ رکھے اور ایسے تمام مواقع سے بچے جہاں ہنسی مذاق اور تفریح کا ماحول ہو، اولاد وغیرہ کو فتنہ (اردو زبان کے معنی میں) سمجھے اور ان کے لیے اپنے اندر کوئی لچک نہ پیدا ہونے دے۔

۴۔ شیخ، استاد یا کسی خاص مسلک کو اصلِ دین سمجھے اور ان سے وابستگی کا حق پوری طاقت سے ادا کرے۔ یعنی شیخ کا مقابلہ ہو جائے تو بلا استثناء وہ تمام مشائخ کو ناقص قرار دے۔ استاد کے تقابل میں تمام علماء کو جاہل بتائے اور اپنے مسلک کے مقابلے میں تمام مسالک کو گمراہی یا کفر سمجھے۔

۵۔ ان مباحات کو بھی شدت اور حقارت کے ساتھ ترک کر دے جنہیں اسلاف تو ایک طرف خود رسول اکرم ﷺ نے خود وقتاً فوقتاً اختیار فرمایا ہو۔

۶۔ ہمیشہ دوٹوک بات کرے خواہ کوئی برا مانے۔

تنبیہ

مسلمان کی شخصیت اور کردار میں ایک مضبوطی، استقامت اور صلابت ہوتی ہے جو مخالفانہ ماحول میں نسبتاً زوردار طریقے سے اظہار کرتی ہے۔ صورتاً یہ چیز سخت مزاجی سے مشابہ ہے لیکن اس کے ازالے کی خواہش یا کوشش کا نتیجہ دینی حمیت سے محرومی ہو سکتا ہے۔ گویا اپنی بندگی پر اصرار اور اس کی حفاظت کا فریضہ پوری قوت سے انجام دینا اصل اخلاق ہے چاہے بظاہر تلخ ہی کیوں نہ لگے۔ جس سخت مزاجی کو طبیعت کا نقص سمجھا جاتا ہے وہ دوسری چیز ہے۔ وہ عموماً اپنے نفس کے لیے ہوتی ہے تربیت کی کمی پر دلالت کرتی ہے جبکہ یہ صلابت دین کے لیے ہوتی ہے اور تربیت کے کمال کو ظاہر کرتی ہے۔ ان دونوں کے فرق کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سخت مزاج آدمی رقیق القلب نہیں ہوتا جبکہ دوسری قسم کا شخص مجاہدانہ کردار کے ساتھ ساتھ رقتِ قلبی سے بھی بہرہ مند ہوتا ہے۔

سخت مزاجی اور اسوۂ حسنہ

ایک مسلمان کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس کا اسوہ قابل تقلید ہو سکتا ہے اور آپ ﷺ کی نرم مزاجی اور حلم کا یہ عالم تھا کہ خود اللہ تعالی نے اس کی تعریف فرمائی اور کہا کہ اگر تم سخت مزاج اور تند خو ہوتے تو یہ لوگ تم سے چھٹ جاتے۔ (آلِ عمران۳:۱۵۹) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم مزاجی کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ کے مرتبے کے ادراک کے باوجود کئی ازواج مطہرات آپ ﷺ کو رُو در رُو جواب دینے سے باز نہ آتیں (۱) اور آپ ﷺ کے خادم لڑکے کا کہنا ہے کہ میں نے نو سال تک آپ ﷺ کی خدمت کی اور کئی بار مجھ سے کوتاہیاں بھی ہوئیں لیکن آپ ﷺ مجھ پر کبھی غصہ ہوئے اور نہ کبھی ڈانٹا۔ (۲)

علاج

اس کے علاج کی تفصیل قساوت قلبی کے تحت دیکھ لی جائے تاہم مندرجہ ذیل باتوں پر عمل کرنے سے طبیعت میں گداز پیدا ہونے کی امید ہے:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ

۲۔ نفل نمازوں میں طویل سجدہ کرنا

۳۔ فرحت بخش ماحول اور غذائیں اختیار کرنا

۴۔ بیماروں کی دیکھ بھال کرنے کا موقع ملے تو اس سے فائدہ اٹھانا

۵۔ دن کا کچھ وقت چھوٹے بچوں کے ساتھ گزارنا

۶۔ تنہائی میں تلاوت کرنا اور تکلف سے رونا۔

❁❁❁

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب فی ایلاء واعتزال النساء

۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحلم واخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم

بے مروتی

حکم ربانی

—﴿ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾(المائدہ۵:۵۴)

(حقیقی مومن وہ ہیں جو) مسلمانوں کے لئے نرم اور کافروں کے لئے سخت ہوں۔

—﴿ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

(آلعمران۳:۱۳۴)

(حقیقی مومن وہ ہیں جو) لوگوں کی غلطیوں سے درگزر کرتے ہیں۔ اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

فرمان نبوی

—"من تواضع لاخيه المسلم رفعه اللّٰه"(۱)

جو اپنے مسلمان بھائی کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند مرتبہ عطا فرماتا ہے۔

—"ان اللّٰه تعالى اوحى اليّ ان تواضعوا حتى لا يبغى احد على احدٍ و لا يفخر احد على احدٍ"(۲)

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تم تواضع اختیار کرو نیز کوئی کسی کے ساتھ زیادتی کرے نہ فخر جتائے۔

تعریف: بے مروتی کا مطلب ہے کسی کے ناراض ہونے کی پرواہ نہ کرنا۔

انسانی معاشرت کا مزاج ہی ایسا ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے بعض

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر، استحباب العفو والتواضع واللفظ للطبرانی

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، باب عرض مقعد المیت من الجنۃ

ایسے مطالبات بھی رکھتے ہیں جنہیں پورا کرنا شرعاً ضروری ہوتا ہے نہ ممنوع۔اس طرح کے مطالبات طاقت رکھنے کے باوجود پورے نہ کرنا بے مروتی ہے۔

مظاہر:

بے مروتی کا اظہار چونکہ متعین صورتوں میں نہیں ہوتا، اس لیے ہم نمونے کے طور پر اس کے چند مظاہر کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ مراتب کا پاس نہ کرنا: بعض مراتب معاشرتی سطح پر اہمیت کے حامل گردانے جاتے ہیں اور ان کی یہ اہمیت صرف معاشرت میں پائی جانے والی صورت کی حد تک ہی نہیں ہوتی بلکہ خود شریعت میں بھی یہ قابل قبول ہوتی ہے۔ اس معاملے میں معاشرتی اقدار کو نظر انداز کرنا بے مروتی ہے مثلاً استاد کا ایک مرتبہ ہے اور اس کی فضیلت خود شریعت سے بھی ثابت ہے تاہم استاد کے ادب کی تقریباً تمام صورتیں معاشرے کے مجموعی مزاج سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر وہ صورتیں شریعت کی مخالفت پر مبنی نہ ہوں تو ان کی پابندی کرنا ایک صحت مند نفسیات کے لیے ضروری ہے اور یہی مروت ہے۔

۲۔ سچ کو خواہ مخواہ درشت اور کڑوا بنا کر پیش کرنا: اچھے اچھے دین دار لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ سچائی کو بدتمیزی اور دل آزاری کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ بے مروتی کی وہ قسم ہے جو شرعاً بھی مذموم ہے۔

۳۔ اپنے خود ساختہ اصولوں کی ایسی پاسداری کرنا کہ کسی مستحق کی مدد یا کسی دوست کی مدارت میں خلل پڑ جائے۔ ایسے آدمی سے عموماً اس طرح کی باتیں سرزد ہوتی ہیں:

''میں تین بجے کے بعد کسی سے نہیں ملتا خواہ کچھ ہو جائے''

"چار بجے میری یہ مصروفیت ہوتی ہے جسے میں کسی بھی قیمت پر ترک نہیں کرتا"

وغیرہ۔اس طرح کی ضابطہ پرستی بھی عین بے مروتی ہے۔

۴۔ کسی سے ذہنی یا طبعی مناسبت نہ ہوتو اس پر اپنی بیزاری ظاہر کر دینا اور یہ سمجھنا کہ اس طرح میں نے ایک تو معاملات کی صفائی کا حق ادا کر دیا اور دوسرے اپنے وقت کے ضیاع کا دروازہ بند کر دیا، یہ بے مروتی تو ہے ہی انسانیت میں کمی کی بھی دلیل ہے۔

۵۔ لوگ کوئی کام کہیں تو صاف انکار کر دینا۔

۶۔ دوستوں یا تعلق والوں سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس پر غضبناک ہو جانا یا ترک تعلق کا فیصلہ کر لینا۔

۷۔ کسی کی دلجوئی میں دلچسپی نہ رکھنا۔

مختصر یہ کہ بے مروتی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسانیت کا مادہ کم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا ضرر ہے جس کی موجودگی میں آدمی اچھا بندہ بننے کی صلاحیت سے محروم ہوسکتا ہے۔تاہم یہ خیال رہے کہ بامروتی مداہنت اور دکھاوا نہیں ہے۔انسان کی زندگی میں ایسے مواقع آتے رہتے ہیں جن میں وہ سختی اور مضبوطی اختیار کرنے کا مکلّف ہوتا ہے۔ایسے مواقع پر معاشرتی معانی میں مروت کا مظاہرہ دراصل مروت نہیں۔صاحب مروت آدمی کی بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ بلاوجہ دلآزاری سے بچتا ہے اور اپنا ہرج کر کے دوسروں کے کام آتا ہے یعنی خوش خُلق اور ایثار والا ہوتا ہے۔

بے مروتی کا واحد علاج خدمت خلق ہے۔لوگوں کے کاموں میں مستعدی کے ساتھ شریک رہنے سے مروت کا وصف اپنے حقیقی معنوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک مسلمان کو کس حد تک بامروت ہونا چاہیے؟ اس کا نمونہ ہمیں اسوۂ حسنہ سے

ملتا ہے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملنے آتے یا دعوت پر آتے تو بعد میں دیر تک بیٹھے رہتے اس سے آپ ؐ کو تکلیف ہوتی لیکن آپ ؐ مروت کے مارے خاموش رہتے اور برداشت کرتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو مداخلت کرنا پڑی اور سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس بارے میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ پیغمبر تو مارے مروت کے خاموش رہتے ہیں تمہیں خود اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ نبی کی ایذا کا سبب نہ بنو۔ (الاحزاب:۳۳:۵۳)

☆☆☆

بیوی بچوں کے ساتھ سخت کلامی اور مار پیٹ

حکم ربّانی

— ﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (البقرہ۲/ ۲۲۸)

عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اس طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں۔

— ﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (النساء۴/ ۱۹)

اور دیکھو، اپنی بیویوں کے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو۔

فرمان نبوی

— "عن معاویہ بن حَیدہ رضی اللّٰہ عنہ قال: قلت یارسول اللّٰہ إما حق زوجة احدنا علیہ؟ قال: ان تطعمها اذا طعمت وتکسوها اذا اکتسبت ولا تضرب الوجہ ولا تقبح ولا تهجر الاّ فی البیت" (۱)

حضرت معاویہ بن حیدہؓ کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ ہم پر بیویوں کے کیا حقوق ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم خود کھاؤ تو انہیں کھلاؤ، خود پہنو تو انہیں بھی پہناؤ، ان سے بدزبانی نہ کرو اور نہ ناراض ہو کر بول چال بند کرو اور (اگر کبھی سختی کرنا ہی پڑے تو) منہ پر نہ مارو۔

— "ما اکرمهن الّا کریم وما اهانهن الا لئیم" (۲)

جو بیویوں سے حسن سلوک کرتا ہے وہ کریم (نیک، مہربان) ہے اور جو ان سے بدسلوکی کرتا ہے وہ لئیم (کمینہ، سفلہ) ہے۔

بدقسمتی سے یہ خرابی ہماری دیہی معاشرت سے نکل کر شہری معاشرت میں بھی

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق المرأة علی الزوج

(۲) عزالدین بلیق، منہاج الصالحین من احادیث وسنۃ خاتم الانبیاء والمرسلین، بیروت ۱۹۷۸ء، ص ۳۴۱

سرایت کر رہی ہے۔اچھے اچھے دین دار اور تعلیم یافتہ لوگ گھر میں خوش اخلاقی اور تحمل و برداشت کا مظاہرہ نہیں کرتے اور ذرا ذرا سی خلاف مزاج بات پر بیوی بچوں کی اہانت کا ہر طریقہ استعمال کرنے پر اتر آتے ہیں۔اس میں چیخنے چلانے سے لے کر گالی گلوچ اور مار پیٹ تک کے مختلف مراحل شامل ہیں۔

اسباب و وجوہات

اس کا ضرر دینی اعتبار سے بھی تباہ کن ہے اور نفسیاتی لحاظ سے بھی۔تاہم اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ان بڑے بڑے اسباب کی نشان دہی کر دی جائے جن سے یہ مرض پیدا ہوتا ہے:

ا۔ طبیعت میں دینداری کی کمی

اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ دین کے چند ظاہری تقاضوں کو پورا کر دیتے ہیں لیکن ان کے دل پر اور ان کے مزاج پر دین کا رنگ نہیں چڑھا ہوتا۔یہ وہ لوگ ہیں جو داڑھی اور لباس وغیرہ پر مبالغے کے ساتھ توجہ دیتے ہیں لیکن دین جس رقت قلبی اور انکسار کا لازمی مطالبہ کرتا ہے اس کی طرف ان کا بالکل دھیان نہیں ہوتا بلکہ دھیان نہ ہونے کی بجائے یہ لوگ اپنے دل کی سختی اور تکدر وغیرہ کو چھپانے کے لیے چند ظاہری اوضاع کی آڑ لے لیتے ہیں۔سچی بات یہ ہے کہ جس آدمی کے اندر زیر دستوں پر شفقت اور چھوٹوں کی غلطیوں پر چشم پوشی کا رویہ نہیں پایا جاتا وہ حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو ماننے اور اس پر چلنے والا نہیں ہے۔اسلام بندگی کو جس ہمہ گیر مزاج کی شکل دینا چاہتا ہے اس کی رو سے طبیعت میں اس طرح کا کوئی مادہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو آدمی کو زندگی کے کسی دائرے میں ظالم اور متکبر بننے پر اکسائے اور اس کے اندر چھپی ہوئی بہیمیت کو

ابھرنے کے مواقع فراہم کرے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو آدمی طبیعت کے اعتبار سے بھی اللہ کا بندہ اور رسول اللہ ﷺ کا امتی ہے وہ تربیت اور تادیب کی مصلحت سے سختی کی کوئی بھی صورت اختیار کرسکتا ہے لیکن لوگوں کو محض اپنے تابع رکھنے کے لیے ان کے ساتھ درشتی اور سخت گیری کا معاملہ نہیں کرسکتا۔

۲۔ بہیمیت کا غلبہ

انسان کے نفس میں بہیمیت ایک ایسی طاقت کے طور پر موجود ہے جس کا مثبت استعمال بھی ممکن ہے اور منفی بھی۔ غیرت، حمیت، شجاعت اور اللہ کے دشمنوں سے نفرت وغیرہ اس طاقت کے مثبت مظاہر ہیں جبکہ ظلم، تکبر، اپنی ذات کے لیے غضب ناکی، غصہ، انتقام، قبائلی عصبیت اور سرکشی وغیرہ اس کے منفی مظاہر ہیں۔ جو آدمی اپنی مرکزیت اور غلبے کے لیے، خواہ وہ گھر کی سطح پر ہی ہو، دوسروں کو گویا پاؤں تلے رکھنے کے لیے کوشاں رہتا ہے وہ دراصل نفس کی اسی منفی بہیمیت کے زیر اثر ہے۔ یہ چیز اسے انسانیت کے مراتب تک اٹھنے نہیں دیتی۔ بیوی بچوں پر کسی دینی اور اخلاقی محرک کے بغیر سختی کرنا واضح طور پر جانوروں کا سا عمل ہے جس کی کوئی اور توجیہ نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ اعصابی تناؤ، احساس کمتری، خوف اور ناکامی وغیرہ

بعض مرتبہ کسی خرابی کے اسباب روحانی اور اخلاقی کی بجائے نفسیاتی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر یہ خرابی اکثر کسی نفسیاتی بگاڑ سے جنم لیتی ہے۔ اس میں مبتلا لوگ عموماً مذکورہ بالا نفسیاتی اور ذہنی عوارض کا شکار ہوتے ہیں مثلاً اعصابی تناؤ کا مریض اپنے سے چھوٹوں پر پھٹ پڑنے کا عادی ہوتا ہے۔ احساس کمتری کا مارا ہوا شخص اپنی برائی کی کوئی ٹھوس اور ثابت کی جاسکنے والی صورت نکالنا چاہتا ہے

جو اسے بیوی بچوں کو ڈانٹ پھٹکار یا مار پیٹ کر ہاتھ آ جاتی ہے۔اسی طرح جن لوگوں کو ناکامی کا ان دیکھا خوف لاحق ہوتا ہے وہ سخت گیر باپ اور جابر شوہر بن کر اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

۴۔ مرد مرکز معاشرت

ہماری معاشرت دین کے پوری طرح تابع نہ ہونے کی وجہ سے چند مستقل ناہمواریوں کا شکار رہی ہے۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہم مردوں کو زندگی کے تمام دائروں کا مرکز سمجھتے ہیں اور مرکزیت کو نافذ کرنے کے لیے طاقت اور غلبے کو ذریعہ بناتے ہیں۔چونکہ یہ رویہ دین کے بنائے ہوئے نظام معاشرت سے ایک ظاہری مماثلت رکھتا ہے لہذا اس کو اختیار کرنے والے لوگ اس کے اندر کوئی شرعی یا اخلاقی قباحت بھی نہیں دیکھتے۔حالانکہ صحیح صورتحال یہ ہے کہ دین کی رو سے مرد زندگی کی بنیادی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے معاشرت کا بیشتر بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھاتا ہے اور یہ ذمہ داری وہ کسی حاکم کی طرح نہیں بلکہ اللہ سے ڈرنے والے بندے کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتا ہے۔جبکہ ہماری معاشرت میں یہ تصور دور دور تک نہیں پایا جاتا۔عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنا اور اولاد کو زرخرید غلام سے زیادہ کا درجہ نہ دینا ہماری معاشرت کا وہ ناسور ہے جو لاکھ کوششوں کے باوجود بھرنے میں نہیں آ رہا اور مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اندر ایک بڑا طبقہ اس رویہ کو شریعت کا تقاضا سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہے۔ہماری قبائلی زندگی کی تقریباً تمام معاشرت اسی رویے کی آئینہ دار ہے۔

اس سبب کے ضمن میں یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ ہماری معاشرت میں دین

سے دوری کی ساری ذمہ داری محض مردوں پر نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اس میں برابر کی ذمہ دار ہیں۔ چونکہ ہم مردوں کی ایک خرابی پر گفتگو کر رہے ہیں لہذا اس میں عورتوں کی خرابیاں زیر غور نہیں لائے۔ وہ ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئیں گی اور وہاں ہم یہ بتائیں گے کہ ہماری سوسائٹی کے بعض طبقات اپنی طرح سے عورت کی حکمرانی کے اصول پر چلنے لگے ہیں اور یہ بھی کہ بیشتر معاشرتی خرابیوں میں خود عورت ایک بنیادی سبب ہے۔

ضرر

تکبر، شقاوت، خود پسندی، فحش کلامی، بے شرمی، خود غرضی اور دل آزاری وغیرہ اس کے دینی مضمرات میں سے ہیں اور ذہنی ونفسیاتی عدم توازن اس کے نفسیاتی مضمرات میں سے ہیں۔ باقی تمہیدی گفتگو سے اسکے ضرر کا مجموعی خاکہ بنایا جا سکتا ہے۔

تاہم ایک پہلو کی قدرے تفصیلی نشان دہی ضروری ہے اور وہ یہ کہ گھر میں مار پیٹ وغیرہ کا رویہ اختیار کرنے والا آدمی اللہ کے دو انعامات سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک گھریلو سکون اور دوسرے محبت کرنے والے بیوی بچے۔ ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان دو چیزوں سے محرومی پوری دنیوی زندگی کو عذاب بنا سکتی ہے۔ اسی طرح ایسا شخص اللہ کے خوف، رسول اللہ ﷺ کی محبت اور عبادات میں حلاوت سے بھی محروم رہتا ہے۔ ان محرومیوں سے آخرت کی زندگی کا نقصان بھی ظاہر ہے۔ اگر آدمی صرف انہی دو نقصانات پر نظر کرلے تو اس آفت سے نکلنے پر قادر ہو سکتا ہے۔

علاج

۱۔ اگر اسباب نفسیاتی ہوں تو کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ یہ تدبیر الحمدللہ صد فی صد کامیاب رہتی ہے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کے ان پہلوؤں کا بطور خاص مطالعہ جو آپؐ کی

گھریلو زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔اس مطالعے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس حصے کو خود پڑھ لیا جائے اور جب ذہن اور طبیعت مانوس ہو جائیں تو پھر گھر والوں کا حلقہ بنا کر ان حصوں کو ایک دوسرے کو پڑھ کر سنایا جائے ۔ایسی صورت میں تبدیلی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

۳۔ ایسے شخص کی بیوی کو چاہیے کہ شوہر کے سامنے کم از کم بدزبانی نہ کرے اور اولاد پر لازم ہے کہ باپ کی فرمانبرداری میں مبالغے سے کام لے۔اس طرح اس شخص کو مشتعل ہونے کا موقع فراہم نہیں ہوگا اور اشتعال کا علاج بھی یہی ہے کہ سب سے پہلے اس کے فوری اسباب کا ازالہ ہونا چاہیے۔

۴۔ اس مرض سے نکلنے کا ایک بہت ہی موثر راستہ یہ ہے کہ مریض تنہائی میں اپنی زبان میں اللہ سے لمبی دعا کرنے کی عادت ڈالے جس میں دو چیزیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہے: تضرع اور بے تکلفی ۔اس طرح کی دعا طبیعت میں گداز اور تواضع پیدا کرنے کے لیے نہایت موثر اور مجرب ہے۔اس سے آدمی کی باطنی اور نفسیاتی تعمیر نو ہو جاتی ہے اور بندگی اس کی پوری شخصیت کا مرکزی اور بنیادی جوہر بن جاتی ہے۔

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو ہر وقت سامنے رکھنا کہ تم میں سے بہتر شخص وہ ہے جس کا رویہ اس کے اہل وعیال کے ساتھ بہتر ہو(۱) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھنا کہ آپؐ ہمیشہ اپنے اہل خانہ سے محبت اور نرمی کا رویہ رکھتے تھے اور شکایت کے موقع پر بھی درگزر سے کام لیتے تھے۔(۲)

۱۔جامع ترمذی،ابواب الایمان،باب فی استکمال الایمان

۲۔سنن ابن ماجہ،کتاب النکاح،باب حسن معاشرۃ النساء

بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دینا

حکم ربّانی

—﴿...... وَلَاتَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ﴾

(الانعام ۶:۱۵۲)

اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ کیونکہ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

—﴿لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا......﴾ (النساء ۴:۱۱)

(اللہ تعالیٰ نے وراثت میں عورتوں اور مردوں کے حصے بیان کرنے کے بعد ان پر عمل کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا) تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہیں زیادہ نفع پہنچانے والا ہے۔

فرمان نبوی

—"مامن مسلم تدرک عنده ابنتان فیحسن صحبتهما الا ادخلناه الجنة"(۱)

جس کی دو بیٹیاں ہوں اور وہ ان کی اچھی تربیت کرے تو وہ جنتی ہے۔

—"......اتقوا اللّٰه فی اولادکم......"(۲)

اپنی اولاد کے بارے میں اللہ سے ڈرو (اور سب سے مساوی سلوک کرو)

ہماری معاشرت میں جو چند جاہلانہ بلکہ حیوانی روایات رائج ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ بیٹے کو بیٹیوں پر مطلقاً ترجیح دینا بنیادی انسانی وصف کے خلاف ہے۔ ایسے والدین مزاجاً عہد جاہلیت کے عربوں کی طرح ہیں اور اسی روایت پر گامزن ہیں جو وہاں نومولود بچیوں کو زندہ گاڑنے کا سبب بنی۔ اس بات میں شبہے کی ادنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ

(۱) سنن ابن ماجہ، ابواب الادب، باب بر الوالد والاحسان إلی البنات

(۲) صحیح مسلم، کتاب الہبات، باب کراهة تفضیل بعض الاولاد فی الهبة

رسول اللہ ﷺ جن لوگوں سے شدید ترین نفرت رکھتے تھے ان میں سے ایک لوگ یہ بھی ہیں[1] ظاہر ہے کہ جس چیز سے رسول اللہ ﷺ کو نفرت ہو، اسے اپنی مستقل روش بنالینا کسی کمزور سے کمزور مسلمان سے بھی ممکن نہیں ہے۔

اس اجتماعی رواج کا یہ اثر ہم دیکھ رہے ہیں کہ عورتوں کی انسانی اور فطری صلاحیتیں کچل کر رہ گئی ہیں بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارا بے دین طبقہ اس برائی سے بڑی حد تک پاک ہے، جبکہ مذہب سے ظاہری اور نمائشی تعلق رکھنے والے طبقات میں یہ خرابی بڑے پیمانے پر موجود ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بے دین اور جدیدیت زدہ طبقوں سے نکلنے والی عورتیں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں اور اپنی ذہنی ساخت کے مطابق معاشرے پر اثر انداز ہونے کا کام بھی کرتی ہیں جبکہ دوسری طرف مذہبیت رکھنے والے گھرانوں کی خواتین اپنے اندر گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ ان کی کوئی صلاحیت پروان نہیں چڑھتی اور پھر وہ ان عورتوں کو رشک کی نظر سے دیکھنے لگتی ہیں جو معاشرے میں آزادانہ طریقے سے اپنا کردار ادا کرتی ہیں اور مردوں سے تعلق کو توڑنے کی علی الاعلان کوششیں کرتی ہیں چاہے اس کے لیے انہیں دنیا کی تمام حدود کو توڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔ اس ساری صورتحال کی ذمہ داری انہی لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں کمتر سمجھا اور اسے ایک معاشرتی ضابطے اور نفسیاتی ساخت کی شکل دے دی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے معاشرتی حالات نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم لڑکوں کی پیدائش پر لڑکیوں کی ولادت کے مقابلے میں زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ شرعی لحاظ سے اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ خوشی قلبی اور طبعی نہ ہو بلکہ محض دماغ سے پھوٹی ہو لیکن مشکل یہ

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی فضل من عالی یتامی

ہے کہ ہم لوگوں کا یہ معاملہ نہیں ہے کہ لڑکی کی پرورش میں پیش آنے والی مشکلات ہمارے پیش نظر رہتی ہوں بلکہ ہم دل سے لڑکوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

مضرات

ذیل میں اس کے چند بڑے نقصانات تحریر کیے جاتے ہیں جنہیں پڑھ کر اس قبیح رسم کے بھیانک نتائج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس کی وجہ سے:

۱۔ عورتوں کی فطری صلاحیتیں مرجھا کر رہ جاتی ہیں خاص طور پر ان کی جنہیں کسی قدر مذہبی رنگ میں پروان چڑھایا جاتا ہے۔

۲۔ دین دار خواتین بھی نفسیاتی اعتبار سے اس نوبت کو پہنچ جاتی ہیں کہ انہیں دین سے متصادم طرز زندگی رکھنے والی عورتیں آئیڈیل معلوم ہونے لگتی ہیں۔

۳۔ عورتوں پر ظلم و تشدد کی طرح طرح کی صورتیں رائج ہیں۔

۴۔ عورتوں کو وراثت میں شریک نہیں کیا جاتا۔یہ گویا شریعت سے اعلانِ جنگ ہے جس کا نتیجہ عذاب الیم ہوگا۔(النساء۴:۱۴)

۵۔ عورتیں نفسیاتی مریض بن کر رہ گئی ہیں جس کی وجہ سے وہ صرف دو ہی کردار ادا کرنے کے قابل ہیں: یا تو لونڈی اور کنیز بن کر رہیں یا جھگڑے اور غیبت وغیرہ کو اپنا مستقل چلن بنالیں۔

۶۔ عورتوں کی اکثریت شکر کے معنی بھی بھول گئی ہے۔

۷۔ اللہ سے ذاتی تعلق اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا جذبہ مجموعی طور پر عورتوں میں نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔

۸۔ عورتوں میں مال کی محبت اور بے حیائی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

غرض عورت ہونا ایک خوفناک چیز بن کر رہ گیا ہے۔

علاج

اس کے علاج کے لیے یہ تصور کافی ہے کہ بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دینے کا ہر عمل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا غضب اور نفرت مول لینے کے مترادف ہے۔ اس خیال کو سنجیدگی سے اپنے اندر راسخ کر لیا جائے تو اس لعنت سے نجات ممکن ہے اور اس کی برکت سے وہ ہمت اور قوت میسر آئے گی جو مسلمان کو برادری وغیرہ کے خلاف اٹھنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ کی گھریلو زندگی کی تفصیلات کا بار بار مطالعہ اس خرابی کے علاج میں اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

رسوم و رواج کی بے جا پابندی

حکم ربّانی

—﴿...... وَتَخْشَى النَّاسَ ، وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ...... ﴾(الاحزاب۳۳:۳۷)

(حضرت زینبؓ سے شادی کے بارے میں رسول اکرم ﷺ مقامی رسم و رواج کی مخالفت کی وجہ سے متردد تھے،اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں؟ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس سے ڈریں!

—﴿ وَاِذَاالْمَوْؤُدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ﴾(التکویر۸۱:۸،۹)

اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی؟

فرمان نبوی

—''من تشبه بقوم فهو منهم''(۱)

جو کسی دوسری قوم کی نقل کرے وہ گویا اسی میں سے ہے (غیر مسلم قوموں کے رسم و رواج کو اپنانا مردود ہے)

—''عن عبداللّٰه ابن عمر رضی اللّٰه عنهما قال:نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن القزع''(۲)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ سر کے کچھ بال منڈوا دیے جائیں اور کچھ چھوڑ دیے جائیں۔(بال کٹوانے میں غیر اسلامی رواج نہ اپنایا جائے)

اسلام نے قومی، علاقائی اور خاندانی رسم و رواج کو اکثر صورتوں میں برقرار رکھا

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشهرة

(۲) صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب القزع

ہے لیکن جہاں یہ کسی واضح حکم یا محکم عقیدے یا دین کے ساتھ وابستگی کی کسی خارجی اور داخلی صورت سے متصادم ہوں تو ان کا انکار ایک دینی تقاضا ہے۔ رسم و رواج انسانی معاشرت میں خوبصورتی اور کشش پیدا کرتے ہیں اور آدمیوں کو ذہنی اور نفسیاتی گھٹن سے محفوظ رکھنے میں کارگر ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں ایک تفریحی عنصر بھی ہے جو دینی نقطۂ نظر سے بھی بعض ضروری شرائط کے ساتھ پسندیدہ ہے۔ نیز ان کی مدد سے لوگ بہتر بنیادوں پر ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں جو کہ معاشرت کی سب سے بڑی غایت ہے۔ تاہم اگر شریعت زندگی کے دائرے کا مرکز نہ رہے تو یہی رسوم و رواج بڑھتے بڑھتے مذہب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یعنی آدمی ان کی پابندی کو اسی طرح لازم کر لیتا ہے جس طرح دینی فرائض کو ہونا چاہیے۔ گویا رسم و رواج کی بے جا پابندی صرف یہی نہیں ہے کہ رسم و رواج کے غیر شرعی ہونے کے باوجود انہیں نبھایا جائے بلکہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مباح رسموں کو بھی دینی جذبے اور مذہبی جوش کے ساتھ پوری پابندی سے ادا کیا جائے مثلاً ہمارے یہاں شادی کی بیشتر رسمیں یقیناً مباحات کی ذیل میں آتی ہیں لیکن ہم لوگ ان سے ایسا چمٹ کر رہ گئے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک رسم کی مجبوراً بھی خلاف ورزی نہیں کرتے مثلاً شادی پہ نیا جوڑا پہننا، بیٹی کو ضرورت بلکہ آسائش کی تمام دستیاب چیزیں دینا، لڑکی والوں کا لڑکے کے لیے جوڑے وغیرہ تیار کرنا۔ اسی طرح لڑکے والوں کی طرف سے بری وغیرہ کا اہتمام، ولیمے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مدعو کر کے اچھے سے اچھا کھانا کھلانا، مہمانوں کا دولہا دلہن کو تحائف پیش کرنا یہ تمام امور مباحات میں سے ہیں یعنی شریعت ان سے روکتی نہیں ہے بشرطیکہ ان کی پابندی ضروری نہ سمجھ لی جائے اور استطاعت نہ ہو تو اس کے باوجود ان سے عہدہ برآ ہونے کا اہتمام نہ کیا جائے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے تقریباً رسموں کو دین سے ٹکراؤ کی حالت میں لا کھڑا

کیا ہے۔ یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ عملاً ہم نے اکثر مباحات کو حرام یا کم از کم مکروہ ضرور بنا لیا ہے۔ ایسی صورتحال میں سچی دینداری کا یہی تقاضا ہے کہ کم از کم ان مروج رسوم سے چھٹکارا حاصل کرلیا جائے جن میں ظاہرداری اور دکھاوا غالب ہے۔اس کے بعد ان رواجوں کا نمبر آتا ہے جن میں نمائش تو نہیں پائی جاتی لیکن وہ کسی نہ کسی دینی ضرر کا موجب بنتے ہیں۔

یہ تو ہوئی اصولی بات ۔باقی عملی پہلو سے اگر ہم صرف اتنی پابندی کرلیں کہ جن رسوم و رواج کو نبھانے میں ہمارا کوئی واضح دینی حرج ہوتا ہے یا ہم پر غیر ضروری بوجھ پڑتا ہے، انہیں بالکل چھوڑ دیں۔ اگر ہم نے یہی کام کرلیا تو قوی امید ہے کہ جو رسوم و رواج بچ جائیں گے وہ ہماری معاشرت اور ہماری نفسیات میں دین کی پسندیدہ کشادگی اور فرحت پیدا کریں گے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم کم از کم ان رسوم و رواج میں سے کچھ کی ایک فہرست بنا دیں جو شرعی لحاظ سے ناپسندیدہ ہیں:

— بسنت منانا
— شادی پر گانے بجانے کا اہتمام
— تہواروں اور تقریبات پر اسراف
— عیدین میں سنت سمجھ کر گلے ملنا
— مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر کا بے جا استعمال
— میلاد شریف وغیرہ کے اکثر اجتماعات
— شادی کی متعدد رسومات جن کی تفصیل مولانا اشرف علی تھانویؒ کی 'بہشتی زیور' اور 'اصلاح الرسوم' میں دیکھی جاسکتی ہے۔
— موت کی رسوم......وغیرہ وغیرہ

نقصانات

رسوم و رواج کی ہر حال میں پابندی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی بدعات میں مبتلا ہونے کی تمام درکار صلاحیتیں پیدا کر لیتا ہے اور بدعت کا معصیت ہونا مسلم ہے(۱) بدعات دراصل رسم و رواج ہی سے جنم لیتی ہیں اور انجام کار توہین سنت بلکہ چھپی ہوئی بے دینی تک پہنچا دیتی ہے۔ دیگر نقصانات یہ ہیں:

- فرائض کی ادائی میں رکاوٹ مثلاً شادی وغیرہ میں اکثر لوگوں کی جماعت فوت ہو جاتی ہے۔
- لہو ولعب میں مشغولیت کا رجحان
- بے پردگی
- اسراف
- دکھاوا
- جاہلی عصبیت یعنی برادری سے باہر رشتہ نہ کرنا وغیرہ۔
- غیر مسلموں سے مشابہت جو شرعاً مذموم ہے۔(۲) مثلاً شادی وغیرہ کی کئی رسمیں ہندوؤں کے مذہبی اطوار سے ماخوذ ہیں۔
- غریبوں اور ناداروں کی دل آزاری
- دنیا کی محبت
- اوقات (بالخصوص راتوں) کا ناجائز استعمال
- وقت کا ضیاع

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، باب تخفیف الصلاۃ و الخطبۃ

۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشھرۃ

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ طرز زندگی سے عدم مناسبت

— مخلوق کی اطاعت

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ رسم ورواج کی بے جا پابندی کا علاج اللہ کے شدید خوف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری محبت اور دین سے مکمل وابستگی کے بغیر ممکن نہیں۔ ان چیزوں کو ارادے کی پوری قوت کے ساتھ اور لوگوں کی ملامت سے بے خوف ہو کر بروئے عمل لانا چاہیے۔ اس کے بغیر اس راستے پر پہلا قدم ہی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ یہی اس کا علاج ہے۔

✿✿✿

کام چوری

حکم ربّانی

— ﴿وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾

(التوبہ۹:۱۰۵)

اور اے نبیؐ! آپؐ ان سے کہیں ''تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور تمہارے عمل کو اللہ، اس کا رسول اور ایمان والے دیکھیں گے، اور تم جلد اس خدا کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو ظاہر اور غیب کا علم رکھتا ہے پھر وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔

— ﴿وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾

(الاحقاف۴۶:۱۹)

اور وہاں لوگوں کے اعمال کے مطابق ان کے اچھے برے درجے ہوں گے تا کہ اللہ سب کو ان کے کیے کا پورا بدلہ دے اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

فرمان نبوی

— ''ان اللّٰہ تعالیٰ یحب ان یری عبدہ تعباً فی طلب الحلال ''(۱)

اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت محبوب ہے کہ بندہ رزق حلال کی کوشش میں خوب تھکے۔

— ''اشد الناس حسرۃ یوم القیامۃ رجل کسب مالاً من غیر حلّہ فدخل بہ النار ''(۲)

روز قیامت سب سے زیادہ حسرت اس شخص کو ہوگی جس نے دنیا میں مال حرام کمایا ہوگا اور اس وجہ سے وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔

---

(۱) رواہ الدیلمی

(۲) مسند احمد بن حنبل، ۳:۴۰۷، ۴۲۷

کام چوری کی پوری تعریف یہ ہے: ان کاموں میں جان بوجھ کر اور بلا عذر کوتاہی اور سستی کرنا جنہیں ہم نے خود اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ ان میں سے بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن کا ہمیں معاوضہ ملتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی ہم نے اپنی مرضی سے ذمہ داری لے رکھی ہوتی ہے۔ پہلے کاموں میں کوتاہی کے نتیجے میں ان سے حاصل ہونے والی آمدنی پوری طرح جائز نہ ہوگی اور دوسرے کاموں کو ٹالنے کے نتیجے میں ہم وعدہ خلافی کا گناہ مول لیتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں کام چوری کے نتائج تشویشناک ہیں۔

یہ مرض کسل، وعدہ خلافی، جھوٹ، فریب دہی وغیرہ کی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

کام چوری کے عادی شخص میں ان میں سے اکثر خرابیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس کے پھیلے ہوئے نقصانات کی تفصیل دیکھنی ہو تو مذکورہ بالا خرابیوں کا بیان دیکھ لیا جائے۔ تاہم کام چوری میں ایک چیز ایسی ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیز کام چوری سے خاص ہے اور وہ ہے رزق حلال کی مطلوبہ خواہش نہ رکھنا اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام کا کار آمد حصہ بننے کی خواہش نہ رکھنا۔ ان دونوں کو ملا کر جو شے وجود میں آتی ہے وہ کام چوری کا لازمہ ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خرابی کتنی بڑی ہوگی کہ جن دو اجزاء سے اس کا وجود عبارت ہے خود ان میں سے ہر ایک جزء مسلمان کی شخصیت کو تباہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ کام چوری ایک وبائی مرض کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ معاشرے میں زیادہ تر لوگ مریض ہو جائیں تو مرض کا احساس اور صحت کی خواہش باقی نہیں رہتی، ہمارے معاشرے کا انتہائی کثیر حصہ اس بیماری میں مبتلا ہے اور اس کے ضرر کا احساس بھی تقریباً مٹ چکا ہے بلکہ اب تو صورتحال یہ ہے کہ جو شخص اپنے حصے کا کام ذمہ داری اور مستعدی سے انجام دیتا ہے اسے پاگل اور احمق گردانا جاتا ہے۔ یہاں اگر ہم غور کریں تو کام چوری کے ایک بڑے سبب تک پہنچ سکتے ہیں اور وہ ہے مال کی محبت۔ ایک ایسی فضا میں جہاں ہر انسانی صلاحیت مال کمانے میں صرف ہو رہی ہو وہاں کام چوری ڈھیرے

دھیرے ایک آسان اور مختصر راستے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس پر چل کر آدمی کسی مشقت میں پڑے بغیر اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ حالانکہ بظاہر یوں لگتا ہے، اور ایک مختلف معاشرتی صورت حال میں یہ بات ٹھیک بھی ہے، کہ کام چور لوگ دولت اور دنیا کے حصول میں زیادہ دلچسپی اور انہماک نہیں رکھتے لیکن ہماری صورت حال ایسی نہیں ہے۔ ہم کام نہ کر کے کام کرنے کے فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری کام چوری دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے آسانی اور چالاکی کے ساتھ حاصل کرنے کی ایک سوچی سمجھی تدبیر ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض لوگ محض طبعاً کاہل اور کسی جسمانی مرض کی وجہ سے اپنے کام انجام دینے کی پوری صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں، ایسے لوگ ہمارا موضوع نہیں ہیں۔ ہمارا اصل موضوع وہ لوگ ہیں جو کام کرنے کی تمام صلاحیت رکھنے کے باوجود ایک تو کام نہیں کرتے ہیں اور دوسرے اس کام کا پھل بھی سمیٹنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

اسباب

گوکہ کام چوری کے بنیادی اسباب ہم اوپر بتا چکے ہیں لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خرابی کے بیشتر اہم اسباب کی ایک فہرست بنا دی جائے تاکہ اسے پہچاننے اور اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں مدد مل سکے:

۱۔ روزی میں حلال اور حرام کی تمیز نہ رکھنا

۲۔ ایسی کاہلی جس نے اخلاقی خرابی کی شکل اختیار کر لی ہو یعنی کسل

۳۔ فریب کاری، جھوٹ وغیرہ

۴۔ وعدہ خلافی کی عادت

۵۔ ایثار کا جذبہ نہ ہونا یعنی خودغرضی

۶۔ پست ہمتی

علاج

اس بیماری کے علاج کا حقیقتاً ایک ہی طریقہ ہے، اس کو اختیار کرلیا جائے تو قوی امید ہے کہ کام چوری سے مکمل نجات مل سکتی ہے، وہ طریقہ یہ ہے کہ حلال آمدنی اور حرام کمائی کے تصور کو دل میں راسخ کرلیا جائے اور کسی بھی قیمت پر اس تصور کی خلاف ورزی نہ کی جائے مثلاً ان وعیدوں کو مستحضر رکھا جائے جو حرام کمائی کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں جیسے حرم کمانے والا دوزخ کا ایندھن بنتا ہے(۱) اس کی دعا قبول نہیں ہوتی (۲) بلکہ نماز، صدقہ، حج غرض کوئی بھی نیک عمل قبول نہیں ہوتا۔(۳)

اگر آدمی یہ طے کرلے کہ اسے حرام تو دور کی بات ہے، مشتبہ رزق سے بھی بچنا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کام چوری کی لعنت میں گرفتار ہو سکے۔ گو کہ علاج کی اور بھی تدابیر ہیں لیکن سب سے موثر یہی تدبیر ہے البتہ ضرورت ہو تو کسل اور وعدہ خلافی کا جو علاج بتایا گیا ہے اسے بھی اختیار کرلیا جائے۔

س: جیسا کہ آپ نے شروع میں کہا تھا کہ اصلاح اخلاق کا آغاز ان اخلاقی امراض کی اصلاح سے کیا جائے گا جن کا تعلق طبیعت اور اس کی بناوٹ سے ہے یعنی جو حال کی خرابیاں ہیں۔ اب جبکہ ان کا بیان مکمل ہو چکا تو امید ہے کہ آپ ان خرابیوں پر بھی گفتگو کریں گے جن کا تعلق ارادہ وشعور سے ہے یعنی افعال کی خرابیاں۔

ج: جی ہاں! ہمارا پروگرام یہی ہے کہ احوال سے افعال کی طرف آئیں لیکن اس سے پہلے ایک بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ احوال کی کسی خرابی کا علاج بھی سمجھدار اور

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۳ ص ۷۰

۲۔ جامع الترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب تفسیر سورۃ البقرۃ

۳۔ مستدرک حاکم، کتاب الزکاۃ، باب من تصدق من مال حرام لم یکن لہ اجر

ج: مخلص آدمی کی مسلسل رہنمائی اور اچھی صحبت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ایسا مریض اپنے علاج کے لیے بتائی گئی تدابیر پر خود سے عمل نہیں کرسکتا تاوقتیکہ کوئی صاحب فراست شخص اسے ہاتھ سے پکڑ کر نہ چلائے۔اس لیے کم ازکم اس معاملے میں ہماری معالجاتی تدابیر کے اصل مخاطب وہ لوگ ہیں جنہوں نے دینی تربیت یا اس کا کوئی پہلو اپنے ذمہ لے رکھا ہو۔ایسے حضرات،امید ہے کہ ان معالجات سے فائدہ اٹھائیں گے البتہ اختیاری وارادی یعنی افعال کی خرابیوں میں مریض بتائی ہوئی تدابیر پر عمل کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور خواہش بھی لہذا اب ہم جو گفتگو کریں گے وہ توقع ہے کہ ایک وسیع ترافادیت اور تاثیر کی حامل ہوگی۔

۞۞۞

باب سوم

امراضِ افعال (ارادہ واختیار) اوران کا علاج

جھوٹ	غیبت	بہتان تراشی
چغلی	فحش کلامی	خوشامد ومداہنت
وعدہ خلافی	بدنظری	طولِ امل
بے ادبی وغلوادب	بدعت	تجسّس
اِسراف	خودرائی	لہوولعب
تن آسانی وآرام طلبی	فریب دہی	مایوسی وڈیپریشن
غصبِ حقوق	کسبِ حرام	

جھوٹ

حکم ربّانی

— ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَایَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴾ (المومن ۴۰:۲۸)

بے شک اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر نے والا اور جھوٹا ہو۔

— ﴿ اِنَّمَا یَفْتَرِی الْكَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴾ (النحل ۱۶:۱۰۵)

جھوٹ وہ لوگ گھڑتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اور وہی جھوٹے ہیں۔

فرمان نبوی

— "آیة المنافق ثلاث: اذا حدّث کذب..." (۱)

منافق کی تین نشانیاں ہیں (جن میں سے ایک یہ ہے) کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔

— "......اِنَّ الْكَذِبَ یَهْدِیْ إِلَی الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ یَهْدِیْ إِلَی النَّارِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَیَكْذِبُ حَتّٰی یُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا" (۲)

بلاشبہ جھوٹ نافرمانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نافرمانی جہنم کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یقیناً آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

س: جھوٹ کیا ہے؟

ج: جان بوجھ کر کوئی ایسی بات کہنا جو جزوی یا مجموعی طور پر خلاف واقعہ ہو، جھوٹ ہے۔ جھوٹ مذاق میں بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسا سنجیدگی سے۔ (۳)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب لایدخل الجنة الا المومنون

(۲) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول اللہ تعالی، ﴿یاایها الذین آمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین﴾

(۳) سنن ابن ماجہ، کتاب السنة، باب اجتناب البدع والجدل

س: کیا آدمی مصلحتاً بھی جھوٹ نہیں بول سکتا؟

ج: یہ صحیح ہے کہ شریعت میں بعض مصلحتوں سے جھوٹ بولنا جائز ہے (جیسے جان بچانے کے لیے [النحل ۱۶:۱۰۶] یا متحارب فریقین میں صلح کروانے کے لیے (۱) لیکن چونکہ ہم نفس کی خرابیوں کو محض قانونی نظر سے نہیں دیکھ رہے لہذا ہم کسی طرح کی مشروط رخصت، عذر اور اباحت کو زیر بحث نہیں لانا چاہتے۔ رخصت طلبی اور عذر پسندی خود ایک خرابی ہے جو کسی فتوے کی تائید ملنے کے باوجود خرابی ہی شمار ہوگی۔ اس لیے ہماری درخواست ہے کہ امراض نفس کے علاج میں کسی محدود اور مشروط جواز پر نظر نہ ڈالی جائے کیونکہ کوئی خرابی اگر کسی وجہ سے قابل گرفت نہ بھی رہے تو اصلاح نفس کا جذبہ اتنا قوی ہونا چاہیے کہ اس وجہ کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ معاملے میں اپنا رویہ جارحانہ اور بہت مثبت رکھیں تب کہیں جا کے نفس کے بگاڑ میں اصلاح کی کوئی صورت نکلے گی۔ اس مرحلے پر مصلحت وغیرہ کا تصور بے معنی بلکہ مضر ہے۔ شریعت کا خاص مزاج یہ ہے کہ ناچاری اور مجبوری کی حالت میں کوئی ناجائز فعل فطرتاً جائز ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کے پیشگی علم کی کوئی ضرورت نہیں۔

س: کیا جھوٹ طبیعت میں اس حد تک راسخ ہو جاتا ہے کہ آدمی لاشعوری اور غیر ارادی طور پر اس کا ارتکاب کرنے لگے اور جھوٹ بولتے وقت اس کی نیت جھوٹ کی نہ ہو؟

ج: بہت سے گناہ خاص طور پر زبان کے گناہ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ آدمی کو غلطی کر گزرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ مجھ سے فلاں غلطی ہوگئی۔ اس طرح کے گناہوں میں جھوٹ سر فہرست ہے۔ اس کی عادت پڑ جائے تو یہ شعوری سے بڑھ کر طبعی ہو جاتا ہے تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس پر سے شعور اور اختیار کی گرفت بالکل ہٹ جاتی ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ قابل مواخذہ فعل نہ رہتا۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب لیس الکاذب الذی یصلح بین الناس

س: یہ خرابی، جس کا بیشتر حصہ بقول آپ کے طبعی ہے کس ترکیب سے قابو میں آسکتی ہے اور اس کے علاج کی موثر تجاویز، جو بہر حال شعوری اور ارادی ہوں گی، کیسے تلاش کی جاسکتی ہیں؟

ج: طبعی گناہ دراصل وہ گناہ ہوتے ہیں جن کی عادت پڑ گئی ہو۔ بری عادت یعنی برے عمل کی تکرار کا علاج اچھے عمل کی تکرار ہی سے ہوسکتا ہے یعنی ایک ہی غلطی خواہ کتنی ہی بار کیوں نہ ہو، اس کے ہر ارتکاب کے فوراً بعد دو چیزوں پر عمل کرنا خود پر لازم کرلینا چاہیے۔ ایک استغفار اور دوسرے اس کے معالجے کی کوئی تدبیر۔ جھوٹ کے معاملے میں بھی یہی کرنا چاہیے کہ جیسے ہی کوئی جھوٹ سرزد ہو آدمی اللہ کے آگے گڑگڑا کر اس کی معافی مانگے اور پھر اس تدبیر پر عمل کرے کہ جسے جھوٹ سنایا ہو اور جس کے بارے میں جھوٹ بولا ہو ان کو اس جھوٹ کی صاف اور غیر مبہم لفظوں میں اطلاع دے اور معذرت کرے۔ یہ تدبیر جھوٹ سے بچنے کے لیے نہایت موثر ہے کیونکہ اس سے نفس کو ذلت اٹھانا پڑتی ہے اور نفس اپنی ذلت گوارا نہیں کرتا۔ جھوٹ کے دیگر علاج حسب ذیل ہیں:

- سچے اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا۔
- زیادہ بولنے سے پرہیز کرنا۔
- اپنے ملنے جلنے والوں کو اپنی اس خرابی سے باخبر کردینا۔
- کثرت تلاوت
- ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل میں زبان کو زیادہ تر اللہ کے ذکر میں مشغول رکھنا (۱)

س: جھوٹ کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: جھوٹ کے گناہ بے شمار ہیں مثلاً:

۱۔ جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب فضل الذکر

۱۔ جھوٹ گناہ کبیرہ ہے(۱) اور نفاق کی ایک علامت ہے(۲) اس کا پہلا نقصان تو یہی ہے کہ آدمی کے اندر منافقوں سے ایک مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۔ جھوٹ بولنے والا معاشرت کے کسی بھی حصے میں خود کو چھپا کر نہیں رکھ سکتا اور لوگ جلدی بھانپ لیتے ہیں کہ یہ آدمی جھوٹا اور دروغ گو ہے۔

۳۔ جھوٹ بولنے کی عادت رفتہ رفتہ سچ بولنے کی صلاحیت ہی ختم کر دیتی ہے۔

۴۔ جھوٹ سے ریا پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ جھوٹ بولنے والا آدمی عموماً چغلی، غیبت اور بہتان سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

۶۔ یہ عادت یا تو رزق کو کم کر دیتی ہے یا سو فیصد حلال نہیں رہنے دیتی کیونکہ جھوٹا آدمی عموماً معیشت کے باب میں بھی مکروفریب کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۷۔ ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے کہ اسے دھوکہ نہ دیا جائے۔ جھوٹ سے یہ حق مجروح ہوتا ہے۔ یہ حق تلفی آخرت میں جہنم میں لے جانے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

۸۔ یہ عادت بال بچوں میں بھی سرایت کر جاتی ہے اور جھوٹے آدمی کے گھر میں بھی جھوٹ ہی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

۱۔ جامع الترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی التغلیظ فی الکذب والزور ونحوہ

۲۔ جامع الترمذی، ابواب الایمان، باب ماجاء فی علامۃ المنافق

غیبت

حکم ربّانی

﴿ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴾(الحجرات ۴۹:۱۲)

تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، تم تو اسے ناپسند کرتے ہو، تو اللہ سے ڈرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت رجوع کرنے والا نہایت مہربان ہے۔

— ﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴾(الاسراء ۱۷:۳۶)

اس چیز کے پیچھے مت پڑو جس کا تمہیں علم نہیں، بے شک کان، آنکھ اور دل، ان سب ہی سے باز پرس ہوگی۔

فرمان نبوی

— ''کل المسلم علی المسلم حرام دمه وعرضه وماله''(۱)

ہر مسلمان کا خون، اس کی آبرو اور اس کا مال ہر دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔

— ''لَمَّا عُرِجَ بِیْ مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَّهُمْ اَظْفَارٌ مِنْ نُحَاسٍ يَخْمِشُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَصُدُوْرَهُمْ ۔ فَقُلْتُ مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرِيْلُ ؟ قَالَ: هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ وَيَقَعُوْنَ فِي اَعْرَاضِهِمْ''(۲)

جب مجھے معراج کرائی گئی تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے، وہ (ان سے) اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے تو میں نے پوچھا، جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں (غیبت کرتے ہیں) اور ان کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں۔

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب البر، باب ماجاء فی شفقة المسلم علی المسلم

(۲) سنن ابی داود، کتاب الادب، باب الغیبه

س: غیبت کی تعریف؟

ج: کسی شخص میں موجود خامی کو اس کی غیر موجودگی میں (بلا کسی شرعی ضرورت کے) بیان کرنا غیبت ہے۔(۱) اس میں ضروری نہیں کہ نیت تحقیر و تذلیل کی ہو۔

غیبت کا تعلق ان گناہوں سے ہے جو معاشرت اور صحبت کی خرابی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی افتادِ طبع سے پیدا ہوتے ہیں جو دین کی مطلوبہ طبیعت سے یکسر متصادم ہے۔ دین ہمارے لئے حقوق العباد اور اس کی نگہداری کا ایک پورا نظام بناتا ہے جس کا مرکزی نقطہ دوسروں کا اکرام اور خیر خواہی ہے یعنی دینی معاشرت کی بنیاد مسلمان بلکہ محض انسان کی تعظیم اور ہمدردی پر استوار ہے۔ ہر وہ عمل جو اس بنیاد پر ضرب لگائے وہ نہایت شدت سے منافیِ دین ہے اور اس کے علاج اور ازالے کے لیے ایسی ہی کوشش اور فکر درکار ہے جیسی کہ آدمی حقوق اللہ کی راہ میں آنے والی رکاوٹیں دور کرنے کی خاطر کرتا ہے یا اسے کرنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ جدید ذہنیت کے اکثر لوگ جس انداز سے حقوق العباد کو حقوق اللہ پر ترجیح دیتے ہیں، وہ بالکل غلط ہے کیونکہ حقوق العباد کی اصل حقوق اللہ ہی ہیں تاہم اتنا ضرور ہے کہ جو چیز حقوق اللہ میں غفلت کا سبب بنتی ہے وہ اس چیز کے مقابلے میں کم خطرناک ہے جو حقوق العباد کی خلاف ورزی پر اکساتی ہے۔ حقوق اللہ میں غفلت عام طور پر نفس کی کسی خُلقی کمزوری (مثلاً کاہلی وغیرہ) کی بنیاد پر ہوتی ہے لیکن وہ داعیہ جو حقوق العباد کو نظر انداز کرواتا ہے سراسر شیطانی ہے اور تکبر پر مبنی ہے کیونکہ شیطان نے بھی اپنی دانست میں حقوق اللہ کے مثالی درجے کو ملحوظ رکھ کر آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ یہ انکار اس قبیل کے تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے۔

ہماری سمجھ میں تو یوں آتا ہے کہ دین گویا ایک نظامِ تعلق ہے جس کی پاسداری

۱۔ صحیح مسلم، کتاب البرّ و الصلة ، باب تحریم الغیبة

کے لیے ایک خاص قسم کی طبیعت اور ذہنیت مطلوب ہے۔ خود اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جس تعلق کا تقاضا کرتے ہیں وہ اپنی ماہیت میں انسانوں میں پائے جانے والے تعلقات سے مختلف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقوق العباد کی صورت میں ہم میں تعلق کی مطلوبہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے جو اپنے کمال کو پہنچ کر حقوق اللہ کی تعمیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص تعلقات کے انسانی دائرے میں کسی بڑی گڑبڑ میں مبتلا ہو اور اللہ کے ساتھ صحیح اور سچا تعلق رکھتا ہو۔ اس اصول کے پیش نظر ہم یہ اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ غیبت یا اس جیسے دیگر معاشرتی گناہ آدمی کو تعلق مع اللہ کی استعداد سے محروم کر دیتے ہیں اور یہی اس کا اصل نقصان ہے۔

س: آپ کی بات سے اندازہ ہوا کہ قرآن میں غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کرنے (الحجرات ۴۹:۱۲) کا کیا مطلب ہے! عام طور پر قرآن وسنت کا یہ مستقل اسلوب دیکھنے میں آتا ہے کہ گناہ کی سخت سے سخت سزا کو بھی اس قدر قابل نفرت اور مکروہ مثال سے نہیں سمجھایا گیا بلکہ اسے خوف پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے لیکن غیبت اور سود کے معاملے میں کراہت کو خوف پر غالب کر دیا گیا ہے۔ اس کا کوئی سبب ذہن میں آتا ہو تو بتائیے؟

ج: یہ اچھا نکتہ ہے۔ بیشتر گناہوں کے لیے واقعی یہ کافی سمجھا گیا کہ ان کے انجام سے خوفزدہ کر دیا جائے لیکن غیبت اور سود جو حقوق العباد کی صریح خلاف ورزی ہیں، ان کے لیے محض انذار پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان کے حوالے سے ایک ایسی تصویر کشی کی گئی جو انسانی نفس کی پست ترین اور مسخ ترین صورت کے لیے بھی سخت گھناؤنی اور قطعاً ناقابل قبول ہے۔ اس کے کچھ اسباب فوری طور پر اس طرح سمجھ میں آتے ہیں کہ ان افعال کے بارے میں ایک فوری اجتماعی ردعمل پیدا کر دیا جائے تاکہ ان

کے سدِ باب میں اجتماعی سطح پر ایک بیتابی پیدا ہو اور دوسرے یہ کہ چونکہ یہ اللہ ہی کا بنایا ہوا قانون ہے کہ بندوں کی حق تلفی وہ معاف نہیں کریں گے بلکہ اس کے لیے متاثرہ آدمیوں ہی کو اختیار دیا جائے گا اس لیے اللہ کی مرضی کچھ یوں معلوم ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی عزت یا وسائل زندگی پر چوٹ لگی ہو ان کے لیے خود پر زیادتی کرنے والوں کو معاف کرنا سخت مشکل بلکہ ایک سطح پر عام آدمی کے لیے تو غیر فطری ہے۔لہذا معافی کے امکان کو زندہ حالت میں موجود رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان غلطیوں کی طرف سے انفرادی و اجتماعی سطح پر ایک مبنی بر نفرت ردِ عمل پیدا کر دیا جائے جن کا آخرت میں معاف ہونا نہایت دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔یہ بھی ایک وجہ وہ سکتی ہے اس اسلوب تمثیل کی۔

نیز یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حقوق العباد کے دائرے میں کوتاہیوں کی ایک لمبی فہرست ہے لیکن غیبت اور سود کے علاوہ غالباً کسی اور کے بارے میں یہ انداز اختیار نہیں کیا گیا۔اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ غیبت اور سود کے اندر بندوں کی حق تلفی کی تمام صورتیں جمع ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ دو گناہ ایسے ہیں جو معاشرے کے تمام افراد میں سرایت کر سکتے ہیں اور رفتہ رفتہ معاشرت کا ایک ایسا ہمہ گیر حصہ بن سکتے ہیں جس کی مضرت ذہنوں سے فراموش ہو جاتی ہے اور یہ خود ایک معاشرتی قدر بن جاتی ہے جیسا کہ ہمارے مشاہدے میں ہے۔ تو گویا یہ نتیجہ نکالنا شائد درست ہو کہ جن گناہوں کا گناہ ہونا فراموش ہو سکتا ہو وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اور ان کے ازالے کے لیے محض ڈرانا کافی نہیں ہوتا بلکہ طبیعت اور ذہن میں ایک مخالف قوت کو ابھارنا پڑتا ہے جو ان کی کشش یا برأس حیثیت کو زائل کر دے جو انہوں نے اجتماعی سطح پر حاصل کر لی ہوتی ہے۔

س: غیبت کی تعریف میں آپ نے یہ بتایا کہ یہ کسی شخص میں موجود خرابی کا اس کی غیر موجودگی میں بیان ہے جس کی کوئی شرعی ضرورت نہ ہو اور چاہے اس میں نیت اس آدمی کی تحقیر و توہین کی نہ ہو، ان دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے کہ یہاں شرعی ضرورت کا کیا مفہوم ہے؟ اور غیبت میں توہین و تحقیر کی نیت کا نہ ہونا کیسے ممکن ہے؟

ج: غیبت کی بنیادی تعریف تو محض اتنی ہے کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کے کسی نقص کا اعلان۔ اس تعریف کو مدنظر رکھ کر آپ غور کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ بعض صورتوں میں ایسا کرنا شرعاً ضروری ہو جاتا ہے مثلاً آپ کے علم میں آیا کہ فلاں شخص کسی مسلمان کو نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس وقت آپ پر یہ واجب ہے کہ اس آدمی کو جسے نقصان پہنچانے کی تیاری کی جا رہی ہے، خبردار کر دیں۔ یہ تو ہوئی شرعی ضرورت، باقی رہا توہین و تحقیر کی نیت نہ ہونا تو یہ بات دو طرح سے ثابت ہے۔ اس کی دینی سند تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے جس کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک خاتون کے بارے میں یہ کہا کہ ''وہ لمبے فراک والی'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اس کی غیبت کی (۱)۔ اب بظاہر اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی نیت اس خاتون کی توہین و تحقیر کی نہیں تھی بلکہ محض پہچان مقصود تھی جسے انہوں نے ذرا بے تکلفی سے کہہ دیا، لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے گرفت فرمائی اور اس کو بھی غیبت پر محمول فرمایا۔ دوسرے اس واقعے میں ہمارے لیے جو سبق پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ عمل جو کسی مسلمان کی سبکی پر منتج ہو سکتا ہو، غلط ہے خواہ وہ مبنی بر بے تکلفی ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری دلیل نفسیاتی ہے۔ بعض مرتبہ آدمی مزاجاً تحقیر کا شعوری قصد نہیں کرتا۔

۱۔ رواہ ابن ابی الدنیا و ابن مردویہ فی التفسیر

ایسی غیبت جس میں تحقیر کا شعوری قصد یعنی نیت نہ کی گئی ہو گی اسی مزاج سے صادر ہوتی ہے۔ ایسے مزاج کی کارفرمائی پر روک لگانا ایک شرعی ذمہ داری ہے۔ امید ہے کہ اب بات واضح ہوگئی ہوگی۔

س: غیبت کے عملی نقصانات کیا ہیں؟

ج: ہر گناہ کی طرح غیبت کے بھی کچھ نقصانات نفسیاتی ہیں اور کچھ معاشرتی۔ اس کا بہت بڑا انفسیاتی نقصان یہ ہے کہ غیبت کے عادی شخص میں گناہ پر ندامت اور توبہ کی خواہش باقی نہیں رہتی۔ مطلب یہ ہے کہ غیبت ایک ایسا گناہ ہے کہ اوّل تو ہم اس کے ارتکاب کے لیے ایسے بہانے آسانی سے ڈھونڈ نکالتے ہیں جن سے اس کا گناہ ہونا محسوس نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں کچھ قصور اہل علم کا بھی ہے جنہوں نے غیبت کے تباہ کن نفسیاتی اور معاشرتی اثرات کو پوری طرح محسوس نہیں کیا اور اس معاملے میں بعض ایسی رخصتیں نکال کر اپنے عمل کے ذریعے سے رائج کر دیں کہ اس نہایت بڑے گناہ کی وہ ہولناکی، جس کا ہر مسلمان کو فطری طور پر احساس ہونا چاہیے تھا، ایک قانونی رخ اختیار کر گئی جس کی وجہ سے وہ خوف نہ ہونے کے برابر رہ گیا جو گناہ سے بچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ ہماری رائے میں اگر اس طبیعت اور ذہن کو بدلنا مقصود ہو جو بعض معاشرتی خرابیوں کی وجہ سے غیبت جیسے گناہ کو معمول بنالیتا ہے تو اس کے لیے اس گناہ کے بارے میں ایک سرد قانونی رویہ اختیار کرنا اور پھر اس کی ایسی درجہ بندی کرنا، جس کے باہمی امتیازات بھی بہت زیادہ واضح نہ ہوں، سخت مضر ہے بلکہ اس کا مضر ہونا پوری طرح ثابت ہو چکا ہے۔ بہتر تدبیر یہ ہوتی کہ غیبت کے پورے عمل کو سختی سے رد کرنے کے بعد بعض انفرادی یا مخصوص صورتوں میں اس کی اباحت کا حکم لگایا جاتا اور جہاں کسی دوسرے مسلمان کے

عیوب کا اظہار اور اطلاع کسی شرعی ضرورت سے ناگزیر ہوجاتی تو وہاں سنت کے مزاج کو اچھی طرح ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا عنوان مشاورت رکھا جاسکتا تھا۔ ایسی مشاورت جو اپنی قبیل میں غیبت سے بالکل مختلف چیز ہوتی ہے۔ جب ہم غیبت کا نام لے کر اس کی کسی صورت کو مباح یا جائز قرار دیتے ہیں تو اس سے عام ذہن اور عام طبیعت پورے عمل غیبت کے جواز پر پہنچ جاتی ہے۔ بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، اب ہم غیبت کے نقصانات نمبروار عرض کرتے ہیں:

۱۔ غیبت کرنے والا دوسرے مسلمانوں کے حقوق پورے کرنے کی صلاحیت گنوا بیٹھتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا تعلق باہمی خیر خواہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ غیبت اس خیر خواہی کے خلاف ہے اور اگر عادت بن جائے تو خیر خواہی کے پورے تصور ہی کو مٹا کر رکھ دیتی ہے۔

۲۔ عام طور پر غیبت حبّ جاہ کی وجہ سے سرزد ہوتی ہے لیکن بعض اوقات خود اس عمل سے حبّ جاہ پیدا ہوجاتی ہے جو ایک ایسی خرابی ہے جو اسلام کے نمونۂ بندگی کے بالکل برعکس ہے۔

۳۔ اس کے عادی شخص میں دو خرابیاں ضرور پیدا ہوجاتی ہیں ایک جھوٹ اور دوسرے چغل خوری اور ان تینوں کا امتزاج غیبت کو بہتان کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔

۴۔ معاشرتی بگاڑ: مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں معاشرتی سطح پر جو چیزیں شرعاً درکار ہیں مثلاً بھائی چارہ اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا وغیرہ، غیبت کا رواج انہیں ختم کردیتا ہے۔

۵۔ غیبت سے نفاق یقیناً اور ریا غالباً پیدا ہوجاتا ہے۔ نفاق اس لیے کہ عام طور پر غیبت دو احوال سے خالی نہیں ہوتی، یا تو یہ برائے تفریح ہوتی ہے یا برائے توہین۔

تفریح میں آدمی کا دل ممکن ہے اس شخص کو اچھا جانتا ہو جس کی غیبت وہ کر رہا ہے اور توہین میں غیبت کرنے والا عموماً خود کو ایک خیر خواہ اور ہمدرد آدمی کے روپ میں پیش کرتا ہے، جو کہ وہ ہوتا نہیں۔ ریا کا خطرہ اس لیے ہے کہ غیبت کرنے والا دوسروں کے جن عیوب کا اظہار کرتا ہے، ان سے خود کو پاک دکھانے کی کوشش بھی کرتا ہے، یہ صاف ریا ہے۔

۶۔ غیبت سے تجسس بھی پیدا ہوتا ہے جس کی ممانعت قرآن و سنت میں آئی ہے (الحجرات ۴۹:۱۲)(۱) غیبت کرنے والے کی نفسیاتی ساخت ہی ایسی بن جاتی ہے کہ وہ دوسروں کی ٹوہ میں رہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۷۔ عیب جوئی: یہ غیبت کے عادی آدمی کی ضرورت ہے کہ دوسروں کے عیب ڈھونڈے اور ان کا ڈھنڈورا پیٹے۔ اس کو آپ غیبت کا سرچشمہ کہہ سکتے ہیں۔

۸۔ سنگ دلی: گوکہ یہ غیبت کا لازمہ نہیں ہے لیکن اس کا خطرہ بہر حال ہوتا ہے۔

۹۔ وقت کا ضیاع: غیبت عام طور پر تفصیل سے ہوتی ہے گویا وقت کا اچھا خاصا حصہ ایک گناہ میں بسر ہوتا ہے جو اپنی جگہ خود بڑا گناہ ہے۔

۱۰۔ بقول مولانا تھانویؒ غیبت کی مضرت دین و دنیا دونوں میں ہے (۲)۔ دنیا کی مضرت تو یہ ہے کہ اس سے باہمی تشویش و نا اتفاقی پیدا ہوتی ہے اور دین کی مضرت یہ ہے کہ قیامت کے دن غیبت کرنے والے کی نیکیاں اس کو مل جائیں گی جس کی غیبت کی تھی۔ (۳)

۱۱۔ عبادات میں دل نہ لگنا، دوسروں کے دکھ درد میں پوری طرح شریک نہ ہونا،

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی عن التحاسد و التدابر

۲۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ (مرتب مولانا محمد دین) شریعت و طریقت ص ۱۷۷، ادارہ اسلامیات، لاہور ۱۹۸۱ء

۳۔ جامع الترمذی، ابواب البرّ و الصلۃ، باب ماجاء فی الذب عن (عرض) المسلم

۱۱۔ لہوولعب، کم عقلی، لاپرواہی، عُجب اور کسی قدر بے حمیتی ...... یہ سبھی غیبت کے نتائج ہو سکتے ہیں اور آخرت کا نقصان یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور دوزخ تو اس فعل قبیح کا نتیجہ ہیں ہی۔(۱)

س: شریعت وطریقت میں مولانا تھانویؒ نے یہ لکھا ہے کہ غیبت غصے کا نتیجہ ہوتی ہے، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: مولانا تھانویؒ کی یہ بات درست ہے لیکن غالباً اس کتاب کے مرتب کرنے والے نے پوری بات نقل نہیں کی۔ غیبت غصے کا بھی نتیجہ ہے لیکن اس کا اصل مصدر کینہ ہوتا ہے یعنی غصہ آیا، اس کا بدلہ لینے کی طاقت نہیں تھی، لہذا اسے دل میں بٹھالیا۔ یہاں غصہ کینہ بن گیا۔ پھر کسی موقع پر اس کینے کا چھپ چھپا کر اظہار کر دیا۔ یہ غیبت ہے۔ کینے کے علاوہ غیبت کی ایک وجہ حسد بھی ہوسکتی ہے۔

س: یہ مرض اتنا بڑا ہے تو اس کا علاج بھی خاصا لمبا اور تفصیلی ہوگا؟

ج: بالکل نہیں۔ غیبت اور دیگر تمام اختیاری وارادی گناہ اپنے اسباب ومضرات میں چاہے جتنے تفصیلی کیوں نہ ہوں، ان کا علاج ہمیشہ سادہ، مختصر اور دوٹوک ہوتا ہے۔ غیبت کا اصولی علاج تو یہی ہے کہ غیبت نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا جائے۔ تاہم اس ارادے تک پہنچنے کے لیے کچھ تدابیر درکار ہیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حسد اور غصے کا ازالہ کیا جائے۔ اس کی تدابیر ان خرابیوں کے علاج کی ذیل میں دیکھ لی جائیں۔ اس طرح غیبت کا منبع بند ہو جائے گا۔

۲۔ جس شخص کی غیبت کی ہو اس سے واضح لفظوں میں معافی طلب کی جائے اور اس معافی کی اطلاع ان لوگوں کو بھی کی جائے جن کے سامنے غیبت کی تھی۔

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الغیبة

۳۔ جن لوگوں کی غیبت کی ہو، ان کے لیے کثرت سے دعائے خیر اور استغفار کی جائے۔(۱) اگر ان میں سے کچھ فوت ہو چکے ہوں یا لاپتہ ہو چکے ہوں یا رسائی سے دور چلے گئے ہوں تو اس عمل میں مزید شدت کی جائے اور اللہ تعالیٰ کے آگے گڑگڑایا جائے کہ اے اللہ! قیامت کے دن ان کے دلوں کو میرے لیے نرم کر دینا۔

۴۔ غیبت سننے سے مکمل پرہیز کیا جائے اور اس میں کسی کی بھی رعایت نہ کی جائے۔ یہ بات یاد رکھیں کہ غیبت سننے والا بھی اتنا ہی گنہگار ہے جتنا غیبت کرنے والا، اور نہ صرف یہ بلکہ مناسب انداز میں غیبت کرنے والے کو ٹوکا بھی جائے اور اسے احساس بھی دلایا جائے کہ وہ کتنا بڑا جرم کر رہا ہے۔ اس عمل کی جزا حضور ﷺ نے جنت قرار دی ہے۔(۲)

۵۔ کچھ مدت تک بلاضرورت کلام نہ کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ اس کے بعد بھی (قلت کلام کی) اس عادت کو جائز حدود میں وسعت تو دے دی جائے مگر اسے یکلخت ترک نہ کیا جائے۔

۶۔ نوافل اور تلاوت کی پابندی، ان سے طبیعت کی ٹیڑھ درست ہوتی ہے اور گناہوں کی رغبت کم ہوتی ہے۔

۷۔ اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے۔

۸۔ اگر کبھی بلاارادہ غیبت سرزد ہو جائے تو معافی وغیرہ کے علاوہ اپنے اوپر کوئی مالی جرمانہ عائد کریں۔ یہ طریقہ ان شاءاللہ تمام گناہوں میں موثر ہے۔

۞۞۞

۱۔ رواہ الطحاوی ورفعہ

۲۔ جامع الترمذی، ابواب البرّ والصلة، باب ماجاء فی الذب عن (عرض) المسلم

بہتان تراشی

حکم ربانی

— ﴿مَايَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّالَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ (ق ۵۰:۱۸)

جو لفظ وہ اپنی زبان سے نکالتا ہے اسے محفوظ کر لینے کے لئے ایک نہ ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔

— ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَااكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ (الاحزاب ۳۳:۵۸)

اور وہ لوگ جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بغیر قصور کے تکلیف پہنچاتے ہیں تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔

فرمان نبوی

— ''أَتَدْرُوْنَ مَاالْغِيْبَةُ؟ قَالُوا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ۔ قَالَ: ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَايَكْرَهُ ۔ قِيْلَ: اَفَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِيْ اَخِيْ مَااَقُوْلُ؟ قَالَ: إِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ، فَقَدْ اغْتَبْتَه، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْهِ مَاتَقُوْلُ فَقَدْبَهَتَّهٗ'' (۱)

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا) کیا تم جانتے ہو، غیبت کیا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اپنے بھائی کا ایسے انداز میں ذکر کرنا جسے وہ پسند نہ کرے۔ آپؐ سے پوچھا گیا، اگر میرے بھائی میں وہ چیز موجود ہو جس کا میں ذکر کروں؟ آپؐ نے فرمایا: اگر اس میں وہ چیز موجود ہو جس کا تو ذکر کرے تو یقیناً تُو نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ بات نہیں ہے جو تو اُس کے بارے میں بیان کرے، تو پھر تُو نے اُس پر بہتان باندھا۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحریم الغیبۃ

—"مَنْ يَضمَنُ لِيُ مابَيْنَ لَحيَيْهِ وَمَابَيْنَ رِجلَيْهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ"(۱)

جوشخص مجھے دو جبڑوں کے درمیان چیز (زبان) کی اور دو ٹانگوں کے درمیان چیز (شرم گاہ) کی حفاظت کی ضمانت دے تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

س: بہتان کسے کہتے ہیں؟

ج: بہتان کی جامع و مانع تعریف جو ایک صحیح حدیث سے ثابت ہے، یہ ہے کہ کسی شخص میں وہ عیب دیکھنا اور اسے مشہور کرنا جو اس شخص میں نہیں پایا جاتا یعنی جھوٹا عیب لگانا۔(۲) اس کو بھی غیبت اور چغلی وغیرہ کے خاندان کا ایک مرض سمجھنا چاہیے۔ ان گناہوں کا محرک ایک ہی ہے یعنی کسی مسلمان بلکہ کسی انسان کو نقصان پہنچانے کی خواہش۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کے علاج میں عموماً وہی چیزیں کارگر ہیں جو غیبت کے علاج میں تجویز کی گئی ہیں، تاہم ایک چیز ایسی ہے جس کو اختیار کرنا اس کے ازالے کے لیے ضروری ہے اور وہ ہے سزا۔ بہتان کا مرض سزا اور رسوائی کے بغیر ختم نہیں ہوسکتا۔ یعنی بہتان کی بیماری میں مبتلا شخص اگر دل سے اپنی اصلاح چاہتا ہے تو اسے ایک تو متاثرہ فریق سے معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ خود کو بدلے کے لیے پیش کرنا چاہیے اور دوسرے اپنی غلطی اور اس سے توبہ کو شہرت دینی چاہیے۔ ان دو باتوں پر عمل کیے بغیر بہتان طرازی کا علاج مشکل ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان

(۲) صحیح مسلم، کتاب البرِّ و الصلة، باب تحريم الغيبة

ایک اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ حقوق اللہ میں ہونے والی کوتاہیاں پوشیدہ رکھی جائیں تو بہتر ہیں، لیکن حقوق العباد کے معاملے میں ہونے والی بعض اقسام کی غلطیوں کو اپنے تعارف کا ایک حصہ بنانا چاہیے تا کہ ان سے ندامت بھی حاصل ہو اور توبہ پر بھی قائم رہنے کی بنیاد پیدا ہو جائے۔

س: حقوق العباد میں ہونے والی غلطیوں کو شہرت دینے کا مطلب کیا ہے؟ بعض لوگ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی غلطی کی پوری تفصیل بیان کی جائے۔ اس طرح کئی مزید خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں مثلاً ایک زانی یہ بتانے لگے کہ میں نے فلاں فلاں کے ساتھ اس فعل قبیح کا ارتکاب کیا ہے تو کیا اس سے دوسرے فریق کی حرمت مجروح نہیں ہوگی؟ اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس اصول کی ایسی وضاحت کر دی جائے جس سے اس طرح کی غلطی کا امکان نہ رہے۔

ج: بہت اچھا سوال ہے۔ اس اصول میں یہ بات محذوف ہے کہ دوسروں کی ایذا کا کوئی سامان نہ کیا جائے۔ حقوق العباد کا یہی بنیادی مطلب ہے۔ آپ کے اندیشے کو حقیقی سمجھتے ہوئے ہم یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن گناہوں کے اشتہار و اعلان سے متاثرین پر حرف آتا ہو، ان کا اخفا ضروری ہے۔ جن گناہوں کے ارتکاب سے کسی کی نیک نامی مجروح ہوئی ہو، اعلان صرف ان کا درکار ہے۔

دوسری بات یہ ملحوظ رہنی چاہیے کہ بعض گناہوں کا تذکرہ ایک طرح کی لذت اندوزی اور فخر کا سبب بھی بن سکتا ہے لہٰذا اظہار گناہگاری میں گناہ کی جزئیات بیان کرنے سے بچنا چاہیے۔

چغلی (نمیمہ)

حکم ربانی

— ﴿ وَلَاتُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ o هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيْمٍ ﴾ (القلم ۶۸: ۱۰، ۱۱)

آپ کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا ہو، بے وقعت ہو، طعنے دینے والا ہو اور چغلی لگاتا پھرتا ہو۔

﴿ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (النور ۲۴/۲۴)

اس دن جب ان کے خلاف خود ان کی اپنی زبانیں، اپنے ہاتھ اور پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ یہ کام کرتے تھے۔

فرمان نبوی

— ''لایدخل الجنة نمام''(۱)

چغل خور جنت سے محروم رہے گا۔

— ''خِیَارُ عِبَادِاللّٰهِ الَّذِیْنَ اِذَارُؤُا ذُکِرَاللّٰهُ وشِرَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الْمَشَّاؤُن بِالنَّمِیْمَةِ الْمُفَرِّقُوْنَ بَیْنَ الْاَحِبَّةِ اَلْبَاغُوْنَ الْبُرَاءِ الْعَنَتَ''(۲)

اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ یاد آئے، اور بدترین بندے وہ ہیں جو چغلیاں کھانے والے اور دوستوں میں جدائی ڈالنے والے ہیں۔ اور جو اس کے طالب اور ساعی رہتے ہیں کہ اللہ کے پاک دامن بندوں کو کسی گناہ میں ملوث یا کسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا کریں۔

س: چغلی کسے کہتے ہیں؟

ج: چغلی، جسے لگائی بجھائی بھی کہا جاتا ہے، ایک زنانہ مرض تھا جو رفتہ رفتہ مردوں میں

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم النمیمہ

(۲) مسند احمد والبیہقی فی شعب الایمان

بھی سرایت کر گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے ایک کی بات دوسرے کو پہنچانا تا کہ ان میں جھگڑا ہو جائے۔

س: چغلی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: چغلی سے ہونے والے نقصانات کی فہرست پیش کرنے سے پہلے چغلی اور اس سے ملتے جلتے گناہوں کے ایک بنیادی سبب کی وضاحت کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ سبب ہے فساد معاشرت، یعنی شریعت نے معاشرت کے لیے کچھ اصول عطا فرمائے ہیں تا کہ ہم مطلوبہ سطح تک دین دار بننے کے لیے ایک پورے انسانی ماحول کی کمک بھی حاصل کر سکیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ دین کے بعض انتہائی بڑے فضائل محض دینی ماحول کی برکت سے نصیب ہوتے ہیں۔ ماحول میں فساد ہو تو آدمی چاہے لاکھ مجاہدہ کرے، ان فضائل کو پوری طرح سے حاصل نہیں کر سکتا۔ جب سے ہم نے دین کے معاشرتی اصولوں سے گریز کی راہ اختیار کی ہے، ہماری پوری نفسیات احکامِ الٰہیہ اور ارشادات نبوی ﷺ کا تاثر قبول کرنے کی صلاحیت بڑی حد تک کھو بیٹھی ہے۔ اس فساد معاشرت کا بہت بڑا سبب بے پردگی اور مردوں عورتوں کا بے قید میل جول ہے۔ اس کا ایک خمیازہ تو ہم واضح طور پر بھگت رہے ہیں کہ اب مردوں میں بھی وہ خرابیاں در آئی ہیں جو پچھلے وقتوں میں ایک خاص قسم کی عورتوں سے مخصوص تھیں، مثلاً زبان درازی، حبِ مال، آرام طلبی، چغلی وغیرہ۔

جو لوگ انسانی معاشرت کے اصول تشکیل کا علم رکھتے ہیں وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے ذہنی، قلبی اور نفسیاتی خصائص کا باہمی امتیاز اگر قائم نہ رہے تو خود انسانیت اپنی روح میں مرجھانے لگتی ہے اور وہ اصول نمو کمزور پڑ جاتا ہے جو نوعِ انسانی کی تہذیبی، تاریخی اور نفسیاتی پیش رفت کی بنیاد ہے۔ کیونکہ ہر شرعی قانون،

قانون فطرت بھی ہے لہذا امرد وزن کو جدار کھنے والی آڑ کو ہٹا کر ہم نے اپنے دین کا نقصان تو کیا ہی ہے، خالص انسانی سطح پر بھی اپنے جواز کو کمزور کرلیا ہے۔ بہر حال اب ان نقصانات کی طرف آتے ہیں جو چغلی کی عادت سے پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ چغلی کا مریض نفسیاتی اعتبار سے ایسا بن جاتا ہے کہ وہ بعض ایسی چیزوں کی طرف اپنی رغبت کنٹرول نہیں کرسکتا جو خلاف شریعت ہیں، مثلاً عورتوں کی صحبت، عیب جوئی، فضول قصے کہانیوں کی مجالسیں وغیرہ

۲۔ چغلی سے مردوں میں ایک طرح کی نسائیت پیدا ہو جاتی ہے جو ان کی بنیادی ساخت سے ناموافق ہونے کی وجہ سے ان کے اندر بعض ذہنی اور نفسی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔

۳۔ طبیعت میں گھٹیا پن

۴۔ بزدلی اور بے حمیتی

۵۔ تجسس اور عیب جوئی

۶۔ جھوٹ، غیبت اور بہتان

۷۔ اس بری عادت کا ایک بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ اس میں مبتلا شخص چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے غفلت کا بھی مریض ہوتا ہے لہذا اس کے اندر رفتہ رفتہ وہ استعداد ہی مر جاتی ہے جو تعلق باللہ کے لیے درکار ہے۔ ویسے بھی یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ گھٹیا باتوں میں منہمک رہنے سے ایک مزاج پیدا ہو جاتا ہے جو دین کے لیے بیزاری کا رویہ پیدا کر دیتا ہے۔ پست فطرت آدمی آسمانی تقاضے کبھی پورے نہیں کرسکتا۔ اس کے اندر یہ صلاحیت ہی مفقود ہو جاتی ہے۔

۸۔ عذاب آخرت: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ چغل خور ہرگز جنت میں نہ جائے گا

(۱)اور دوسری جگہ فرمایا کہ اس کے ہونٹ قیامت میں لوہے کی قینچیوں سے کاٹے جائیں گے۔(۲)

س: چغلی کی عادت کا علاج کیا ہے؟

ج: یہ مرض غیبت کی قبیل سے ہے اس لیے اس کا پورا علاج غیبت کے علاج کے ضمن میں ہی ہو جاتا ہے، لہذا اس کے علاج کے لیے اس کتاب کا وہ حصہ دیکھ لیا جائے جہاں غیبت کا علاج مذکور ہے۔

۞۞۞

۱۔صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم النمیمہ

۲۔سنن بیہقی، شعب الایمان، ج۴ص۵، دارالکتب العربیۃ، بیروت۱۹۹۰ء

فحش کلامی

حکم ربّانی

—﴿ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَایٔ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ ﴾(النحل ۱۶:۹۰)

اے مسلمانو! بے شک اللہ حکم دیتا ہے انصاف کا، لوگوں کے ساتھ بھلائی کا اور رشتہ داروں کی امداد کرنے کا۔ اور وہ تمہیں روکتا ہے بے حیائی سے، ہر برائی سے اور سرکشی سے۔

—﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾(النور ۲۴:۱۹)

بے شک جو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کا چرچا ہو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک سزا ہے اور یاد رکھو کہ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

فرمان نبوی

—"سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر"(۱)

مسلمان کو گالی دینا فسق (اللہ کی حکم عدولی) اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔

—"لیس المومن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی"(۲)

مومن طعن و تشنیع کرتا ہے نہ لعنت اور فحش کلامی کرنے والا ہوتا ہے اور نہ بدزبان۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینہی من السباب واللعن

(۲) سنن الترمذی، ابواب البر، باب ماجاء فی اللعنۃ

س: کیا فحش کلامی کی یہ تعریف کافی ہے کہ جو شخص ایسے الفاظ زبان پر لائے جو شریعت، تہذیب اور مروجہ اخلاق کی رو سے رکیک ہوں تو اسے فحش گوئی کہا جائے گا؟

ج: جی ہاں! یہ ایک جامع تعریف ہے۔ گالیاں بکنا، ناشائستہ مذاق کرنا، اور جن چند باتوں کو شریعت نے مخفی رکھنے کی تاکید کی ہے انہیں بلا ضرورت، محض تفریح طبع کے لیے کھول کر بیان کرنا، فحش گوئی ہی کے بڑے بڑے مظاہر ہیں۔

س: فحش گوئی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: فحش گو آدمی تمام عبادات کی برکت اور فیض سے محروم رہتا ہے خصوصاً وہ عبادات جن میں زبان کا کوئی کردار ہو۔ یعنی ایسا شخص ذکر، تلاوت وغیرہ کی طرف اول تو مائل ہی نہیں ہوتا اور اگر اس کا کوئی معمولی سا میلان اس میں پیدا ہو بھی جائے تو بھی وہ اس کے ابتدائی فوائد بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی بد نصیبی ہوگی کہ آدمی عبادات ہی کے لائق نہ رہے۔ فحش گوئی کے معاشرتی، اخلاقی اور دینی نقصانات اتنے واضح ہیں کہ ان کی نشان دہی طوالت کا موجب ہوگی۔ مختصر طور پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق زبان کی حفاظت آدمی کو جنت میں لے جاتی ہے (۱) اور اس کا غلط استعمال انسان کو جہنم تک پہنچا دیتا ہے (۲) اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھی بات کرو ورنہ خاموش رہو۔ (۳)

س: فحش گوئی کا علاج کیا ہے؟

ج: فحش گوئی کے علاج میں مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

ا۔ اپنے سے بڑے اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان

۲۔ جامع الترمذی، ابواب الایمان، باب ماجاء فی حرمۃ الصلاۃ

۳۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر

۲۔ موت کی یاد

۳۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)، کسی صحابی یا اسلاف میں سے کسی بزرگ کا تذکرہ تفصیل سے پڑھنا اور اسے ذہن میں دہرانا۔

۴۔ زبان کو کسی مختصر ورد کا عادی بنانا

۵۔ بے تکلف دوستوں کو بھی آپ جناب سے مخاطب کرنے کی عادت ڈالنا

۶۔ نظر بد سے بچنے کی کوشش کرنا

۷۔ اپنے اختیار کو پوری طرح کام میں لانا۔

مداہنت اور خوشامد

حکم ربّانی

—﴿مَایَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّالَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ﴾(ق ۵۰:۱۸)

جولفظ انسان اپنی زبان سے نکالتا ہے اسے محفوظ کر لینے کے لیے ایک نہ ایک مستعد نگران (فرشتہ) موجود ہوتا ہے۔

—﴿وَلَاتَلْبِسُواالْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُواالْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾(البقرہ ۲:۴۲)

اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور سچ کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ۔

فرمان نبوی

—''اذارأیتم المداحین فاحثوافی وجوههم التراب''(۱)

جب تم خوشامدیوں کو دیکھو تو ان کے چہروں پر مٹی ڈالو۔

—''عن ابی بکرةؓ، قال:أثنی رجل'' علی رجل عندالنبیؐ، فقال: ویلک قطعت عنق اخیک'' ثلاثا'' من کان منکم مادحاًلامحاله فلیقل احسب فلاناً، واللّٰه حسیبه' ان کان یری انه کذلک ولا یزکی علی اللّٰه احداً......''(۲)

حضرت ابی بکرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک صاحب نے دوسرے کی تعریف کی تو آپؐ نے (تین دفعہ) فرمایا: کہ تم نے تو اسے ہلاک کر دیا۔ پھر فرمایا کہ اگر تمہیں کسی کی تعریف کرنا ہی ہو اور وہ حقیقتاً اس تعریف کا مستحق ہو تو یوں کہو کہ فلاں کو میں ایسا سمجھتا ہوں اور حقیقت سے تو اللہ ہی واقف ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب النہی عن المدح اذا کان فیہ افراط

(۲) صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب النہی عن المدح اذا کان فیہ افراط

س: کیا مداہنت اور خوشامد میں کوئی فرق ہے؟

ج: مداہنت اور خوشامد ایک ہی مزاج کے مظاہر ہیں تاہم ان کی تعریف میں ایک فرق ہے۔ اس فرق کے فہم کے لیے پہلے ایک بات سمجھ لیں کہ مداہنت کل ہے اور خوشامد اس کا ایک جزو۔ خوشامد اپنے کسی دنیاوی مفاد کو حاصل کرنے کے لیے کسی بااختیار شخص کی جھوٹی تعریف کرنے کو کہتے ہیں، جب کہ مداہنت میں کم از کم ایک بڑی چیز زائد ہے۔ مداہنت کرنے والا اپنے مطلب کے لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانے کا اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ حق اور ناحق کی تمیز بھی کھو بیٹھتا ہے، یعنی خوشامدی آدمی جب اپنے ممدوح کی ناجائز باتوں اور ناروا افعال کی بھی تائید کرنے لگے تو وہ خوشامد سے بڑھ کر مداہنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ گویا کسی کو جھوٹی سچی تعریفوں سے خوش کرنا خوشامد ہے تو غیر مشروط طور پر ہاں میں ہاں ملانا یا منہ دیکھی بات کرنا مداہنت ہے۔

س: ان دونوں خرابیوں کا بڑا محرک کیا ہے؟

ج: دنیا پرستی اور غیر اللہ کا خوف، ان خرابیوں کے بنیادی محرکات ہیں۔ یہ خرابیاں کبھی فائدہ اٹھانے کی ہوس سے پیدا ہوتی ہیں اور کبھی نقصان سے بچنے کے لیے۔ اس لیے خوشامدی اور مداہن آدمی دنیا طلب اور بزدل ضرور ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے جو اس بگاڑ کا سبب بھی کہلا سکتی ہے اور نتیجہ بھی، اور وہ ہے بے حمیتی۔ یعنی ان خرابیوں میں مبتلا آدمی غیرت وحمیت سے بھی محروم ہوتا ہے یا بالآخر ہو جاتا ہے۔

س: ان کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: چند بڑی خرابیوں کا ذکر تو اوپر آ چکا ہے۔ باقی کچھ یوں ہیں:

۱۔ جھوٹ کی عادت پڑ جاتی ہے

۲۔ ریا اور نفاق ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں

۳۔ اللہ سے تعلق مجموعی طور پر بے معنی اور کمزور ہو جاتا ہے

۴۔ دین کا مطلوبہ معیارِ شخصیت بالکل اجنبی بن کر رہ جاتا ہے اور آدمی اسے پسندیدہ طلب کرنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔

۵۔ عیاری اور مکاری

۶۔ دل سخت ہو جاتا ہے

۷۔ حق اور خیر کی کشش باقی نہیں رہتی

۸۔ دینی شخصیات خصوصاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی حقیقی بنیاد غائب ہو جاتی ہے۔

۹۔ اللہ کا خوف دل سے رخصت ہو جاتا ہے

۱۰۔ ہمت کی پستی اور طبیعت کی گراوٹ آگھیرتی ہے

۱۱۔ خوشامدی آدمی کہیں بھی قابل عزت نہیں رہتا، حتیٰ کہ گھر میں بھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کی تعریف میں مبالغہ شیطانی فعل ہے(۱) اور چونکہ خوشامد ممدوح کو فتنہ میں ڈالنے کا شدید احتمال رکھتی ہے اس لیے ایک آدمی نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک دوسرے آدمی کی تعریف میں مبالغہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے اسے ذبح کر دیا۔(۲) اور اسی وجہ سے صحابۂ کرام کا یہ طریقہ تھا کہ وہ حسب فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم خوشامدی کے منہ پر سچ مچ مٹی ڈال دیا کرتے تھے، جیسا کہ کتب حدیث میں آتا ہے کہ ایک صاحب نے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف ان کے منہ پر کی تو حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے منہ پر مٹی ڈال دی اور حضرت

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی کراھیۃ التمادح

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما یکرہ من التمادح

عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوچھنے پر بتایا کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔(۱)

س: ان کا علاج کیا ہے؟

ج: خوشامد اور مداہنت کا شمار ان امراض میں ہوتا ہے جن کا مریض علاج کی ضرورت یا رغبت سرے سے محسوس نہیں کرتا لہٰذا اس کا علاج مریض کو نہیں بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے خیر خواہ لوگوں کو بتایا جاتا ہے۔اس سلسلے میں مندرجہ ذیل چیزیں اِن شاءاللہ مفید اور موثر ہو سکتی ہیں:

۱۔ ایسے آدمی میں عزت نفس کا شعور اور احساس ابھارنے کی مسلسل کوشش کی جائے۔ یہ کوشش کبھی اس کو تعظیم دے کر کی جائے اور کبھی غیرت دلا کر۔آغاز میں اس کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرنے کی تدبیر کرنی چاہیے تا کہ اس کے اندر وہ جوش پیدا ہو جائے جو بہت بنیادی نوعیت کے فیصلے کرنے پر اکساتا ہے۔اس کے بعد اسے یہ باور کرانا چاہیے کہ خود تمہارے اندر ایسے بہت سے اوصاف ہیں جنہیں بروئے کار لا کر تم دوسروں کے لیے انسانی خوبیوں اور کامیابیوں کا ایک نمونہ بن سکتے ہو۔ان دونوں پہلوؤں سے آگے بڑھنے کے لیے جو عملی صورتیں درکار ہوں گی وہ چونکہ انفرادی ہیں لہٰذا ان کی تفصیل میں نہیں جایا جا سکتا۔آدمی اور حالات کو دیکھ کر کوئی مناسب طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اس کے سامنے ان عظیم شخصیات کا زیادہ سے زیادہ تذکرہ کرنا چاہیے جو دنیاوی اور ذاتی مفادات سے بلند ہو کر کامیابیوں اور کامرانیوں کی انتہا پر پہنچے ہوں۔ان میں بھی وہ شخصیات زیادہ کارگر رہیں گی، جن میں غیرت، بہادری اور غربت شدت سے پائی جاتی ہوں۔

۱۔صحیح مسلم، کتب الزھد، باب النھی عن المدح

۳۔ خوشامدی آدمی عام طور پر گفتگو میں تیز ہوتا ہے، اگر ایسا ہو تو اس شخص سے فرمائش کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی شان، رسول اللہ ﷺ کی ثنا اور معروف صحابہؓ کی عظمت بیان کرے۔ اگر وہ اس طرف آجائے تو شروع میں اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ پھر دو چار مرتبہ کے بعد اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جا سکتی ہے کہ ان تقریروں کی کوئی جھلک خود اس کی ذات میں کیوں نہیں آتی؟ اس طرح ایک مثبت اور محرکِ عمل ندامت پیدا ہو سکتی ہے۔

۴۔ اس آدمی کو جہاں بھی خوشامد میں مشغول دیکھیں سختی سے ٹوک دیں۔ اس کا بہترین علاج اس حدیث مبارکہ میں بیان کر دیا گیا ہے جس کی رو سے منہ پر تعریف کرنے والے پر خاک ڈالنی چاہیے(۱)۔ خوشامد کے علاج میں یہ ایک مشکل لیکن انتہائی موثر عمل ہے۔

۱۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، باب المدح

وعدہ خلافی

حکم ربّانی

— ﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (المائدہ ۵:۱)

اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو۔

— ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (۱۷:۳۴)

عہد کو پورا کرو، اس لئے کہ عہد کی بابت پوچھا جائے گا۔

فرمان نبوی

— ''اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ، كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ، كَانَ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: اِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ، وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ''(۱)

چار خصلتیں ہیں، جس میں وہ ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی، یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب کوئی عہد کرے تو بے وفائی کرے اور جب کسی سے جھگڑے تو خوب لڑے اور بدزبانی کرے۔

— ''لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ'' يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُقَالُ هٰذِهِ غَدْرَةُ فُلَانٍ''(۲)

قیامت والے دن ہر عہد توڑنے والے کے لئے ایک جھنڈا ہوگا، کہا جائے گا کہ یہ فلاں کی بدعہدی کا جھنڈا (نشان) ہے۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق

(۲) صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب إثم الغادر

س: وعدہ خلافی کی تعریف کیا ہے؟

ج: وعدہ خلافی کی ضروری تعریف عام طور پر لوگوں کو معلوم ہی ہے، تاہم سہولت کے لیے ہم اس کمزوری کے دو حصے کر سکتے ہیں: ۱۔ وعدہ کرتے وقت ہی اسے پورا کرنے کی نیت نہ ہونا۔ ۲۔ وعدہ کرتے وقت اسے پورا کرنے کی نیت تو ہونا لیکن بغیر کسی قوی عذر کے اسے پورا کرنے کی جو کوشش ضروری ہے، اس سے دانستہ گریز یا تساہل کرنا۔

پہلی قسم دراصل دھوکا اور فریب ہے جس کا اظہار وعدہ خلافی کی صورت میں ہوتا ہے، البتہ دوسری قسم اصل وعدہ خلافی ہے جسے حدیث شریف میں نفاق کی ایک علامت فرمایا گیا ہے(۱) ہم یہاں اسی دوسری قسم تک محدود رہیں گے۔

س: جیسا کہ آپ نے کہا وعدہ خلافی کا مطلب ہر آدمی جانتا ہے لیکن غالباً اکثر اس عمل کی باریکیوں پر نظر نہیں رکھتے لہذا نتیجتاً اس میں مبتلا رہتے ہیں یا وعدہ خلافی کی ایک بے لچک تاویل پر اعتماد کر کے ان اعذار کو بھی قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتے جن کی وجہ سے وعدے کا پورا نہ ہوسکنا وعدہ خلافی کے زمرے میں نہیں آتا۔ لہذا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس مسئلے کی کچھ وضاحت کر دی جائے؟

ج: آپ کے سوال کی حدود میں رہیں تو وعدہ خلافی کا تعین مشکل ہو جائے گا کیونکہ وعدہ خلافی کی عادت میں مبتلا شخص جھوٹ اور فریب کاری کی عادت میں بھی اکثر گرفتار رہتا ہے۔ اس لیے عادی وعدہ خلاف کے بتائے ہوئے بیشتر اعذار، اِلّا ماشاء اللہ، عام طور پر جھوٹ ہی ہوتے ہیں۔ اس صورت حال میں بہتر طریقہ غالباً یہ ہوگا کہ ہم وعدہ خلافی سے متعلق ایک عمومی گفتگو کر لیں جو کم از کم اس آدمی کے لیے ضرور مفید ہوگی جو کسی درجے میں اس برائی کا شکار ہے اور اس سے نکلنا

(۱) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق

ہے۔ ہمارے پیش نظر یہی آدمی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا کہ وعدہ خلافی کے تین اہم اجزا ہوتے ہیں:

۱۔ جھوٹ ۲۔ کاہلی، اور ۳۔ فریب کاری

اگر ہماری تعریف کو ملحوظ رکھا جائے تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محض ایفائے عہد نہ ہونا وعدہ خلافی نہیں ہے۔ وعدہ خلافی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی قوی عذر کے بغیر ہو۔ وہ اعذار جو عہد پورا نہ کر سکنے کو وعدہ خلافی کے حکم میں نہیں آنے دیتے اپنی نوعیت کے اعتبار سے تین طرح کے ہوتے ہیں:

۱۔ ناتجربہ کاری

۲۔ نسیان

۳۔ ایسے خارجی موانع جنہیں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

س: عذر کی ان تین قسموں کی مزید وضاحت کر دی جائے تو مناسب ہوگا؟

ج: ۱۔ ناتجربہ کاری یہ ہے کہ ایک آدمی کو اس کام کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں تھا جس کی تکمیل کا اس نے وعدہ کر لیا تاہم اس عذر کی بنیاد پر آدمی وعدہ خلافی کے الزام سے تو بچ جائے گا لیکن غیر ذمہ داری کا مرتکب ضرور قرار پائے گا جو اپنی جگہ ایک نقص ہے۔

۲۔ نسیان: اس کا عذر ہونا ظاہر ہے اور اسے شریعت نے بڑے بڑے دینی کاموں میں بھی عذر مانا ہے، جیسے روزے میں بھول کر کھا پی لینا۔(۱)

۳۔ خارجی موانع: عام طور پر تسلیم شدہ خارجی موانع بہت سے ہیں مثلاً وعدہ کرنے والے کا سخت بیمار ہو جانا، کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جانا، ایفائے عہد کے لیے

(۱) صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب الصائم اذا أکل أو شرب ناسیا

۳۔ جو صلاحیتیں درکار ہیں، ان میں سے کچھ یا کسی ایک کا فقدان ہو جانا، ناگہانی حالات اور موسم وغیرہ۔ ان میں سے کسی ایک کی موجودگی میں خود ایفائے عہد کا منتظر شخص بھی وعدہ خلافی کا شکوہ نہیں کرتا۔

س: وعدہ خلافی کے اسباب کیا ہیں؟

ج: — خوشامد

— لاپرواہی

— ڈسپلن کی کمی

— بہانے بازی

— طبیعت میں جھوٹ کا رجحان

— خودغرضی

— دوسرے سے وقتی طور پر جان چھڑانے کی خواہش

— حمیت کی کمی

— دوسرے کو اہمیت نہ دینا

— کسل

— حسن معاشرت سے محرومی وغیرہ۔

اس کی ضروری تفصیل یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ آدمی وعدہ خلافی کیوں کرتا ہے؟ اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں لیکن ان میں کچھ چیزیں مشترک ہوں گی مثلاً کسی آدمی سے اپنا مطلب نکالنے کے لیے اس کے کسی کام کو پورا کرنے کا وعدہ کر لینا، محض چاپلوسی میں بلا سوچے سمجھے کوئی ذمہ داری اپنے سر لینا یا دوسروں کی نظر میں اچھا بننے کے لیے ان کی ہر فرمائش پر ہاں کر لینا یا جس کام کا کوئی تجربہ نہ ہو اسے انجام دینے کی حامی بھر لینا یا کسی کو

ٹالنے کے لیے اسے کوئی امید دلا دینا یا کاہلی وغیرہ۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو وعدہ خلافی کی تمام صورتوں میں ان اسباب میں سے کچھ ضرور پائے جائیں گے جو اوپر بتائے گئے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ ان میں سے ایک آدھ سبب پہلی نظر میں نامانوس لگے گا لیکن تھوڑا سا تدبر کر کے اس کا تعلق سمجھ میں آ سکتا ہے مثلاً بے حمیتی کو وعدہ خلافی سے یہ نسبت ہے کہ ایک حمیت والا آدمی اپنے اوپر وعدہ خلافی کا داغ لگوانا ہرگز پسند نہیں کرے گا لہذا وہ وعدہ سوچ سمجھ کر کرے گا اور پھر اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جان لڑا دے گا۔

س: دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض ایسے حضرات جو قابل رشک دینی فضائل کے حامل ہوتے ہیں وہ بھی اس بیماری میں مبتلا ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: بدقسمتی سے آپ کا مشاہدہ ٹھیک ہے۔ ہمارے یہاں دین، عبادات یا عبادات سے ظاہری نسبت رکھنے والی چیزوں تک محدود کر دیا گیا ہے جب کہ دین میں پھیلاؤ کی جو قوت اور انسانی زندگی کا احاطہ کرنے کی جو طاقت پائی جاتی ہے، وہ اپنی روح میں اجتماعی اور معاشرتی ہے۔ جن اصحاب فضیلت کا آپ نے حوالہ دیا ہے ان کی فضیلت کی، اگر سب نہیں تو اکثر و بیشتر بنیادیں، کثرت ذکر و عبادت یا حسن اخلاق اور رقیق القلبی کی چند مسلمہ صورتوں پر استوار ہیں۔ سچی بات تو یہی ہے کہ ایسی دینداری، جس کی سچائی اور اخلاص سے ہمیں انکار نہیں، اگر وعدہ خلافی جیسی نہایت خطرناک خرابی پر حاوی نہیں آ سکتی تو اس کا سیدھا سا مطلب یہی ہے کہ یا تو ان حضرات کا تصور دین محدود ہے یا پھر ان کی دینداری میں ایک بڑا نقص تا حال موجود ہے۔ ویسے حسن ظن کے طور پر شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے لوگوں کی مشغولیات میں تنوع اور کثرت ہوتی ہے جس کی وجہ سے بعض ضروری

معاملات یا تو انہیں یاد نہیں رہتے یا ان کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔

س: وعدہ خلافی کی عادت کا علاج کیا ہے؟

ج: اس علاج کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب تک وعدہ خلافی کی عادت پوری طرح ختم نہ ہو جائے، آدمی کو کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔

۲۔ وعدہ خلافی کے علاج کے دو اصول ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا محرک دریافت کر کے اس کا ازالہ کیا جائے اور دوسرا یہ کہ اس پورے مزاج ہی کی اصلاح کا ڈول ڈالا جائے جس کے لیے وعدہ خلافی ایک طبیعی چیز بن جاتی ہے۔

پہلے اصول کی روشنی میں دیکھیں تو وعدہ خلافی کا ایک عمومی محرک یہ ہے کہ معاملات پر سے شریعت کی گرفت کمزور پڑ جائے۔ اس کے لیے پہلے درجے میں معاملات کے بارے میں شریعت کے احکام معلوم کرنے چاہئیں اور خاص طور پر ان احکام سے روگردانی کی جو سزا بتائی گئی ہے اسے ذہن میں دہراتے رہنا چاہیے اور تنہائی میں اپنے تخیل کو بروئے کار لا کر ان سزاؤں کو گویا نظر کے سامنے مجسم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ مشق ان شاء اللہ نفس کی بہت سی خرابیوں میں موثر ثابت ہوگی۔ ایک صحیح حدیث میں چونکہ وعدہ خلافی کو نفاق کی نشانیوں میں سے ایک نشانی فرمایا گیا ہے لہذا اس سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک بالواسطہ طریقہ یہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اپنے اندر اس یقین کو تقویت دینے کی کوشش کی جائے جس کا شریعت مطالبہ کرتی ہے۔ جیسے جیسے یہ یقین قوی ہوتا جائے گا ویسے ویسے نفاق کے پوشیدہ امکانات بھی ختم ہوتے جائیں گے۔

یہ یقین پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ تین اجزا پر مشتمل ہے:

ا۔آیات انذار پر تدبر، خواہ خود سے یا کسی عالمِ دین کی مدد سے

۲۔کثرت ذکر، خصوصاً استغفار کی کثرت، اور

۳۔لوگوں کے چھوٹے چھوٹے کام کرنا۔ چھوٹے کاموں سے مراد وہ کام ہیں جو معاشرتی سطح پر ایک شخص کے معروف مرتبے سے کمتر ہوں۔

اللہ کے فضل سے قوی امید ہے کہ ان چیزوں کو ملحوظ رکھ کر ان پر عمل کرنے کی سچی کوشش کر کے نفس کا وہ داعیہ پوری طرح قابو میں آجائے گا جو دیگر گناہوں کے ساتھ ساتھ وعدہ خلافی پر اکساتا ہے۔

۳۔ نفس میں رذائل کی رغبت ترہیب سے اور فضائل سے غفلت ترغیب سے دور ہوتی ہے۔ یہ نفس یا مزاج کی اصلاح کا ایک جامع قاعدہ ہے۔ وعدہ خلافی کی عادت میں مبتلا شخص کو ترہیب کے عمل سے گزرنے کی تجویز ہم اوپر دے آئے ہیں۔ اس کی حیثیت نظری تھی اب ہم ترہیب کا عملی پہلو تجویز کریں گے۔

ایک سادہ سی وعدہ خلافی میں بھی تین گناہ تو ضرور موجود ہوتے ہیں:

ا۔جھوٹ ۲۔کسی کا حق تلف کرنا، اور ۳۔فرض کی ادائی میں کسل

اگر غور سے دیکھیں تو اس پورے مجموعے میں ایک چیز بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ وعدہ خلافی کا مرتکب شخص حقوق العباد یا انسانی تعلق و معاشرت کے دینی اصول کو ضروری اہمیت دینے کی طرف ارادتاً مائل نہیں ہوتا اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ معاشرت کا فساد، خواہ اپنے وقوع میں کسی قدر داخلی ہی کیوں نہ ہو، سزا اور خوف کے بغیر ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس اصول کے تحت وعدہ خلافی کے ارتکاب کے بعد خود پر ملامت اس گناہ کے کفارے اور آئندہ کے لیے اس سے بچنے کی خواہش، خود کو کسی سزا سے گزارے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ ویسے بھی انسانی معاشرت

کے ضمن میں حقوق العباد کو مجروح کرنا، اپنی کلیت میں قابل معافی نہیں ہے یعنی الفاظِ توبہ اور احساس ندامت اس کے کفارے کے لیے کافی نہیں تاوقتیکہ اس نقصان کی تلافی نہ کی جائے جو دوسرے بندے کو پہنچایا گیا ہو۔ لہٰذا وعدہ خلافی ہو جائے تو ضروری ہے کہ توبہ و ندامت کے ساتھ ساتھ متاثرہ فریق سے معافی بھی حاصل کی جائے خواہ اس کے لیے کتنی بھی ذلت و مشقت سے گزرنا پڑے۔ یاد رکھیں کہ نفس کی قوتوں میں تین قوتیں بنیادی ہیں:

۱۔ انانیت ۲۔ سرکشی، اور ۳۔ شہوت

ان میں سے ہر ایک اپنے دفعیے کے لیے ایک خاص طرح کی سختی اور شدت کی متقاضی ہے۔

۴۔ وعدہ خلافی کا ایک انتہائی موثر علاج نماز باجماعت کی پابندی ہے۔ اس تجویز کو ہرگز ہلکا نہ سمجھیں۔ تاثیر کے اعتبار سے غالباً اس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔

س: وعدہ خلافی کے نقصانات؟

ج: ۱۔ دینی اعمال میں استقامت نہیں رہتی

۲۔ اخلاص کمزور پڑ جاتا ہے اور دوسروں کی خیر خواہی کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے۔

۳۔ غیر ذمہ داری اور کسل کو تقویت ملتی ہے۔

۴۔ جھوٹ اور بہانے بازی کی رفتہ رفتہ عادت پڑ جاتی ہے۔

۵۔ وعدہ خلاف آدمی لوگوں کی نظر میں ہلکا اور ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے۔

۶۔ بڑی چیزوں کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

بدنظری

حکم ربانی

— ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ....﴾

(النور۲۴:۳۰)

اے نبیؐ! آپ ﷺ مومن مردوں سے کہیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں۔

— ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ﴾ (النور۲۴:۳۱)

اور اے نبیؐ! آپ مومن عورتوں سے کہیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

فرمان نبوی

— ''العينان زناهما النظر ......''(۱)

آنکھوں کا زنا (غیر محرم کو) دیکھنا ہے۔

— ''وعن جرير رضى الله عنه قال: سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن نظر الفجأة فقال: اصرف بصرك''(۲)

حضرت جریرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اگر (غیر محرم پر) اچانک نظر پڑ جائے تو (کیا کروں؟) آپؐ نے فرمایا اپنی نظر پھیر لو۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب زنی الجوارح

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فیما یومر بہ من غض البصر

س: بدنظری کیا ہے؟

ج: بدنظری کے دو پہلو ہیں: ایک نامحرم کو رغبت اور شہوت کی نظر سے دیکھنا۔ دوسرے نامحرم پر بلاضرورت قصداً دوسری نگاہ ڈالنا۔

س: بدنظری کے اسباب کیا ہیں؟

ج: بدنظری ایک ایسا مرض ہے جس میں خاصی تعداد میں وہ لوگ بھی مبتلا ہیں جو بظاہر دیندار ہیں۔ اس کا شمار ان گناہوں میں ہوتا ہے جو طبیعت میں دینداری کے فقدان اور کمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ بدنظری چونکہ چوری کی طرح کا ایک عمل ہے جس میں آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس کا پتہ دوسروں کو نہیں چلے گا لہذا اس کا بھرم کھلنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ یہ دو وجوہ، یعنی طبیعت میں دینداری کا نہ ہونا اور ریاکاری، خود اپنی جگہ بدنگاہی سے بھی بڑی خرابیاں ہیں۔

ان کے علاوہ بعض ضمنی اسباب بھی ہیں مثلاً بری صحبت، مخلوط تعلیم، گھر میں بے پردگی کا ماحول، سیر و تفریح اور بازاروں میں پھرنے کی عادت، ٹی وی ڈراموں اور فلموں کی طرف رغبت اور ایسے لٹریچر کا ذوق جس میں عورتوں کی تصویریں وغیرہ ہوں۔

س: بدنظری کے مضر اثرات کیا ہیں؟

ج: اس کے مضر اثرات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ بے حیائی اور بے حمیتی

۲۔ ریاکاری

۳۔ نفس میں پاکیزگی کے امکان کا خاتمہ۔

۴۔ ایسے دینی اعمال میں خرابی جن میں ذہن بھی شامل ہوتا ہے۔

۵۔ بدنظری سے آدمی کے اندر اور باہر کا ماحول بگڑ جاتا ہے یعنی نہ باطن مسلمان کا باطن

رہتا ہے اور نہ معاشرت اس قابل رہتی ہے کہ اس میں اسلامی زندگی کے تقاضوں کو سہولت سے پورا کیا جا سکے گویا یہ ہماری اندرونی حالت اور معاشرت دونوں میں دینی خرابی پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔

۶۔ اس کی وجہ سے عورتوں کو وہ آزادی دینا محال ہو جاتا ہے جو خود دین نے انہیں دی ہے۔

۷۔ خیانت کی عادت

س: بدنظری کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کے معالجے میں سب سے پہلے وہ تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے طبیعت میں دین کی قبولیت پیدا ہو اور ریا کا سد باب ہو۔ طبیعت میں دین کی قبولیت کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں مفید ہیں:

— دین دار، منکسر المزاج اور آپس میں محبت رکھنے والوں کی صحبت

— کسی شفیق اور ذہین مربی سے نسبت

— اچھی قرأت کی سماعت

— استغفار اور درود شریف کی کثرت، پورے دھیان کے ساتھ۔

— نفل نماز میں آنکھ بند کر لینے سے بھی طبیعت متاثر ہوتی ہے یہ عمل کبھی کبھی کر لینا چاہیے۔

ریا کا جو علاج اس کتاب میں بتایا گیا ہے، بدنظری کے معاملے میں اس سے بھی مدد لی جائے۔ عمومی معالجے کے طور پر مندرجہ امور کو اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے:

۱۔ بدنظری کے مواقع سے بچنا، چاہے اس سے کوئی دینی فضیلت یا دنیاوی ضرورت ہی کیوں نہ متاثر ہوتی ہو۔

۲۔ زیادہ تر وقت اچھے لوگوں کے ساتھ بسر کرنا خاص طور پر باہر نکلتے وقت یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کچھ اچھے اور بڑے لوگوں کی معیت میسر ہو۔

۳۔ اس خواہش کا غلبہ ہو تو تکلف سے یہ خیال لانا چاہیے کہ جس نظر سے میں دوسروں کو دیکھ رہا ہوں اس نظر سے میری ماں، بہن اور بیٹی کو دیکھا جائے تو میرا کیا حال ہوگا؟

۴۔ عورت کی تصویر کو دیکھنا بھی بدنظری کے حکم میں داخل ہے۔ اس سے شدت سے پرہیز کرنا چاہیے اور اس وہم میں نہیں رہنا چاہیے کہ محض ایک سادہ سی تصویر کا نفس پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ یہ تمام تصویریں ذہن میں جمع ہو کر آدمی کے اندر ایسی خرابیاں پیدا کر دیتی ہیں کہ جن کا احساس اور ادراک بہت بعد میں ہوتا ہے۔ سچا مسلمان وہ ہے کہ جس کا تخیل اور حافظہ بھی ناپسندیدہ چیزوں سے پاک ہو۔ یہ بے احتیاطی اس پاکیزگی کو قائم نہیں ہونے دیتی۔

۵۔ موت کی یاد اور دوزخ کا تصور

۶۔ وہ ارشاد ربانی ذہن میں رکھنا چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ نے بدنظری کو خیانت سے تعبیر کیا ہے اور شاہانہ تہدید کے انداز میں فرمایا ہے کہ تمہاری بدنظری مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے (المومن ۴۰:۱۹) اور نبی کریم ﷺ کا وہ قول مبارک بھی سامنے رکھنا چاہیے جس میں آپ ﷺ نے بدنظری کو آنکھ کا زنا قرار دیا ہے (۱) العیاذ باللہ من ذلک۔

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۱ ص ۴۱۲، المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۸۳ء

طولِ امل

حکم ربّانی

—﴿ذَرْهُمْ يَاكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾ (الحجر ۱۵:۳)

اے نبیؐ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو چھوڑ دیں کہ وہ کھائیں پئیں، عیش کریں اور خیالی امیدوں میں مگن رہیں۔ آیندہ انہیں اپنا انجام معلوم ہو جائے گا۔

—﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (التکاثر ۱۰۲:۱،۲)

لوگو! تمہیں بہت زیادہ حرص نے غافل کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچتے ہو۔

فرمان نبوی

—''لایزال قلب الکبیر شاباً فی اثنین فی حب الدنیا وطول الامل''(۱)

بوڑھے آدمی کا دل دو چیزوں کے بارے میں ہمیشہ جوان رہتا ہے ایک دنیا کی محبت اور دوسرے لمبی لمبی تمنائیں۔

''عن عبداللّٰہ قال: خط النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطا مربعا وخط خطاً فی الوسط خارجاً منہ، وخط خططا صغاراً إلی ھذا الذی فی الوسط من جانبہ الذی فی الوسط ، فقال: ھذا الانسان وھذا اجل محیط بہ ، وھذا الذی ھو خارج املہ، وھذہ الخطط الصغار الاعراض، فان اخطأہ ھذا نھشہ ھذا، وإن اخطأہ ھذا نھشہ ھذا''(۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر ایک مربع شکل بنائی۔ پھر اس کے وسط میں ایک خط کھینچا جو اس سے باہر نکل رہا تھا اور مربع

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب کراھۃ الحرص علی الدنیا

(۲) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب فی الامل وطولہ

کے وسط میں جو خط تھا اس سے باہر نکلتے ہوئے متعدد چھوٹے چھوٹے خط کھینچے اور فرمایا: یہ (مربع گویا) انسان (کا مسکن) ہے اور مربع کا بیرونی خط گویا موت ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہے اور جو خط باہر نکل رہا ہے وہ اس کی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں اور یہ جو چھوٹے چھوٹے خط ہیں، یہ اس کے وہ تجاوزات ہیں جو وہ راہِ حق سے ہٹ کر کرتا ہے۔

س: طولِ امل سے کیا مراد ہے؟

ج: طول امل یعنی لمبی لمبی امیدیں باندھنا اور ایسی خواہشات رکھنا جن کی تکمیل کے لیے لمبا عرصہ درکار ہے۔

س: آپ کی تعریف سے یہ واضح نہیں ہوا کہ طول امل دنیاوی معاملات میں ہوتا ہے یا دینی امور میں بھی اس کا دخل ہو سکتا ہے؟

ج: طول امل دین میں بھی ہوتا ہے اور دنیا میں بھی۔ دین میں طول امل کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ساری دنیا میں اسلامی نظام کے نفاذ اور غلبے کے خواب دیکھتا رہتا ہے لیکن خود اپنی ذات پر بالکل سامنے کے احکام کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتا اور اسلام کے ان مطالبات پر تو اس کا دھیان نہیں رہتا جو گھنٹے دو گھنٹے میں ممکن العمل ہیں مگر منصوبے وہ لمبی مدت کے بناتا ہے جن کی کامیابی کے ضروری اسباب اسے میسر نہیں ہوتے۔ یہ شخص گویا دین سے کوئی سچی اور سنجیدہ وابستگی نہیں رکھتا بلکہ اپنے دینی نقائص کو خود اپنی نظر سے اوجھل رکھنے کے لیے ایسی بڑی بڑی باتیں سوچتا رہتا ہے جو اگر پوری ہو جائیں تو دین کے عظیم ترین فضائل حاصل ہو سکتے ہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں دینی معاملات میں طولِ امل اپنی بے عملی پر پردہ ڈالنے یا اس کی خلش سے بچنے کی ایک کوشش ہے۔

دنیامیں طول امل یہ ہے کہ ایک آدمی ترقی اور کامیابی کے ایسے منصوبوں میں خود کو منہمک کرلیتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے عمر نوح بھی کم ہو۔ یعنی اس پر دنیا کی محبت کا ایسا غلبہ ہے کہ وہ بالکل سامنے کی چیز یعنی انسانی زندگی کی محدودیت کو بھی فراموش کردیتا ہے۔

یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بیشتر خرابیوں کی طرح اس خرابی کے بھی بعض نقصانات دینی ہیں اور بعض نفسیاتی۔

س: تو کیا نفسیاتی ضرر دینی ضرر نہیں ہوتا؟

ج: اگر دینی ضرر کو قانونی معنی میں یعنی آخرت کے نقصان کے معنی میں لیا جائے تو ضروری نہیں کہ ہر نفسیاتی ضرر دینی ضرر بھی ہو، کیونکہ نفسیات میں خلل پیدا کرنے والی کئی چیزیں شریعت میں عذر سمجھی جاتی ہیں اور عذر کا مضر نہ ہونا واضح ہے مثلاً پاگل پن ایک نفسیاتی خرابی تو ہے مگر قانونی نقطۂ نظر سے اسے دینی خرابی نہیں کہا جا سکتا۔

س: ذرا ٹھہر کر طول امل کے دینی اور نفسیاتی نقصانات پر کچھ روشنی ڈال دیں؟

ج: طول امل کے دینی نقصانات:

ا۔ طول امل کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ بندے کے ذہن میں توکل، دعا، توفیق وغیرہ کا صحیح دینی تصور یا تو باقی نہیں رہتا یا اتنا بگڑ جاتا ہے کہ اسے ان چیزوں سے ادنیٰ مناسبت بھی حاصل نہیں رہتی۔ مثلاً کسی غبی آدمی کا یہ دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ اسے امام ابوحنیفہؒ بنا دے یا کسی ناکارہ شخص کی یہ امید کہ وہ اللہ کی توفیق سے عمر بن عبدالعزیزؒ ایسا بن سکتا ہے یا کسی فاسق و فاجر کی یہ خوش فہمی کہ اللہ اسے جنت پیش کردے گا۔ یہ سب طول امل کی مثالیں ہیں جن سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک یا تو، توکل کو مسخ کرتی ہے یا دعا اور توفیق کے تصور کو۔ اب سوچنے

کی بات یہ ہے کہ توکل، دعا اور توفیق وغیرہ تعلق باللہ کے وہ لوازم ہیں جو بندگی کی عمارت میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اگر انہی میں خرابی پیدا ہو جائے تو بقیہ عمارت کو گرنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے؟ اس چیز کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عام طور سے طول امل سے بندگی کی ایک جھوٹی فضا پیدا ہوتی ہے جو بظاہر حقیقی بندگی کی فضا سے کہیں زیادہ وسیع اور پرکشش ہوتی ہے۔ اس میں مبتلا ہو کر بندہ بندگی کی حقیقی حدود سے اس طرح تجاوز کر جاتا ہے کہ اس کا فہم بھی بگڑ جاتا ہے اور ذوق بھی۔ ظاہر ہے کہ صحیح فہم اور صحیح ذوق سے محروم ہو کر دین سے تعلق کی کوئی شرط بھی پوری نہیں ہو سکتی۔

۲۔ اس سے ایک خاص طرح کا نفاق پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ آدمی کی نظر اپنی واقعی شخصیت کی بجائے مفروضہ شخصیت پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں دیکھتا کہ میں واقعتاً کیسا ہوں۔ بلکہ جو وہ ہونا چاہتا ہے اسے اپنی حقیقی شخصیت فرض کر لیتا ہے۔ یہ نفاق کی وہ قسم ہے جو کلیتاً قانونی نہ ہونے کے باوجود اپنے بعض مضمرات کی وجہ سے اصطلاحی نفاق سے کچھ بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ ایسا آدمی لاشعوری اور غیر ارادی طور پر ہی سہی مگر دین کی حقانیت کا زیادہ قائل نہیں رہتا اور اس کے باوجود خود کو دین کے اعلیٰ مراتب پر دیکھتا ہے یا دیکھنا چاہتا ہے۔

۳۔ بے عملی، یعنی طول امل کی وجہ سے طبیعت میں روزمرہ کے ضروری دینی اعمال کی طرف سے بے رغبتی بلکہ تحقیر سی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ جو شخص خواب میں بادشاہ بنا بیٹھا ہو وہ بیداری میں مزدور بننا پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح جو لوگ بہت بڑے بڑے منصوبے بناتے رہتے ہیں وہ اپنی عملی صلاحیت اور اس کے استعمال کی طرف زیادہ مائل نہیں ہوتے۔ یہی بے رغبتی اور عدم میلان بڑھتے بڑھتے بے عملی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ویسے یہ بھی ملحوظ رہے کہ بے عملی طول امل کا ایک بڑا

محرک بھی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ طول امل بے عملی سے پیدا ہوتا ہے اور بے عملی ہی پیدا کرتا ہے۔

۴۔ خود پسندی: طول امل کے بنیادی محرکات میں بے عملی کے ساتھ خود پسندی سرفہرست ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ طول امل میں گرفتار شخص خود پسند نہ ہو۔

۵۔ رجوع الی اللہ یعنی توبہ سے محرومی۔ طول امل کے مارے ہوئے آدمی میں وہ آنکھ ہی اندھی ہو جاتی ہے جو اپنے نقائص کا مشاہدہ کرواتی ہے اور بندے کو استغفار پہ اکساتی ہے۔

۶۔ غور سے دیکھیں تو طول امل ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مذاق ہے۔ یعنی ادنیٰ استحقاق کے بغیر اللہ سے بڑے بڑے مطالبے کرنا اس سے مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

طول امل کے نفسیاتی نقصانات:

۱۔ بے عملی، دنیاوی پہلو سے

۲۔ شعور اور ارادے کے فطری تعلق کا کمزور پڑ جانا۔ اس سے آدمی نارمل انسانوں کی فہرست میں شامل رہنے کے قابل نہیں رہتا۔

۳۔ وہم اور التباس کا غلبہ

۴۔ پست ہمتی اور فرار پسندی

۵۔ خوش فہمی خصوصاً اپنے بارے میں

۶۔ غیر متوازن داخلیت، جس سے آدمی کے اندر دوسری چیزوں سے تعلق کی استعداد کم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے۔

۷۔ دوہری شخصیت یا شیزوفرینیا یعنی آدمی کی شخصیت کا دو حصوں میں بٹ جانا اور غیر حقیقی شخصیت کا حقیقی شخصیت پر غالب آ جانا۔

طول امل کے انہی نقصانات کی وجہ سے قرآن حکیم نے بھی اس کی مذمت کی ہے (الحجر ۱۵:۳)اور رسول کریم ﷺ نے بھی اسے فساد کی جڑ قرار دیا ہے(۱)۔

س: طولِ امل کا علاج کیا ہے؟

ج: طولِ امل اگر دنیاوی معاملات میں ہوتو اس کا بہترین علاج انفاق ہے۔ انفاق اگر اپنے مطلوبہ معیار کے ساتھ ہوتو یہ دنیاوی طول امل کا فطری علاج ہے۔ انفاق کے بارے میں تفصیلی کلام تو اِن شاء اللہ ہم اس کتاب کے فضائل کے حصے میں کریں گے، تاہم سردست اس کا وہ پہلو واضح کردینا ضروری ہے جسے ابھار کر طول امل سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ پہلو جو ایک طرح سے انفاق کی روح ہے، یہ ہے کہ اپنی کوئی پسندیدہ یا ضروری چیز اللہ کی راہ میں دے دی جائے۔ اس کے بغیر انفاق اندر سے ناقص ہے اور اتنا موثر بہر حال نہیں رہتا کہ کسی باطنی خرابی کا ازالہ کرسکے۔ اپنی پسندیدہ چیزیں اللہ کی راہ میں دے دینا یا کسی دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر عملاً ترجیح دینا، آدمی کو پہلے ہی قدم پر دنیا اور اس عارضی زندگی کی محبت سے ایک درکار حد تک دور کردیتا ہے۔ یہ دوری ہی دراصل طول امل کا علاج ہے۔

دوسرا علاج، جو دراصل انفاق ہی کا ایک شعبہ ہے، یہ ہے کہ آدمی دولت اور جائیداد وغیرہ بنانے کی تگ و دو میں اتنا مشغول نہ ہوجائے کہ بعض شرعی مطالبات واضح طور پر مجروح ہونے لگیں۔ یہ شرعی مطالبات یاد رہے کہ صرف قانونی سطح تک محدود نہیں ہیں۔ اللہ اپنے بندوں کو حصول فرائض میں حریص دیکھنا چاہتا ہے۔ ہماری وہ مصروفیات جو اس حرص کو ختم یا کمزور کردیں ہماری اس بندگی کو کامل نہیں ہونے دیتیں جس کا اللہ تعالیٰ ہم سے

۱۔ سنن بیہقی، شعب الایمان، دار الکتب العربیۃ، بیروت ۱۹۹۰ء

مطالبہ کرتا ہے۔ گویا اگر کوئی شخص اپنی ضروریات سے زائد اسباب کے لیے اتنا وقت اور محنت صرف کرتا ہے کہ اس کے اندر دین میں آگے بڑھنے کا تقاضا مدہم پڑنے لگے تو اس آدمی کو اس بارے میں سنجیدگی سے فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ دنیا جمع کرنے کی بیشتر صورتوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ اس کوشش میں جتنی کامیابی ہوتی جائے گی اتنی ہی طول امل سے رہائی کی صورتیں بھی نکلتی چلی جائیں گی۔

اصولی بات یہ ہے کہ جو بندہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دے گا اور اخروی زندگی کو دنیوی زندگی کے مقابلے میں زیادہ حقیقی سمجھے گا وہ طول امل سے نکل جائے گا۔ یہ اصول کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

طول امل کا ظہور دینی سرگرمیوں میں بھی ہوتا ہے۔ اس کے عموماً دو اسباب ہوتے ہیں: اپنے آپ کو ممتاز کرنے کی خواہش اور جذبات کا ذہن پر غالب آ جانا۔ پہلا سبب ظاہر ہے کہ منافیٔ اخلاص ہے اور اپنی جگہ طول امل سے بھی ایک بڑی برائی ہے البتہ دوسری وجہ مخلص لوگوں کو پیش آتی ہے اور غلط ہونے کی صورت میں بھی لائق اجر ہے۔ تاہم علاج دونوں کا ضروری ہے۔ پہلی صورت میں علاج کا واحد راستہ اخلاص کی کمی کو دور کرنا ہے۔ اس کی تدبیروں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ دوسری صورت میں علاج کی دو سادہ سی ترکیبیں ہیں:

۱۔ اس بات پر یقین کہ بندہ نتائج پیدا کرنے کا مکلّف نہیں ہے۔ ہوگا وہی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کبھی خالی از مصلحت نہیں ہوتی۔ اس استحضار سے جذبات کی وہ شدت کم ہو جاتی ہے جو ذہن سے کام نہیں لینے دیتی۔

۲۔ زمینی حقائق یعنی اپنی صلاحیت اور باہر کی صورتحال کا صحیح اندازہ لگانا۔ اس سے ذہن میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جو جذبات کو غالب آنے سے روک سکتی ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ طول امل دنیاوی معاملات میں ایک ہولناک چیز ہے۔ دینی

امور میں اس کی بنیاد سرے سے غلط بھی ہو تو بھی مثبت ہے، لہذا علاج کے لیے ترجیح اس کی پہلی قسم کو دینی چاہیے۔ کیونکہ اس سے ایک رذیلے کا ازالہ ہوگا۔ طول امل کی دینی نوعیت کا معالجہ کسی برائی کے خاتمے کے لیے نہیں بلکہ ایک فضیلت یعنی فراست کے حصول کے لیے ہے۔

۞۞۞

بے ادبی اور غلوِّ ادب

حکم ربّانی

—﴿ یَااَھْلَ الْکِتَابِ لَاتَغْلُوْافِیْ دِیْنِکُمْ وَلَاتَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّاالْحَقَّ ﴾

(النساء۴:۱۷۱)

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو اور کمی بیشی نہ کرو اور اللہ کے بارے میں صرف حق بات کہو۔

—﴿ یَااَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْالَاتَرْفَعُوْااَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَاتَجْھَرُوْالَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِبَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَاتَشْعُرُوْنَ ﴾ (الحجرات۴۹:۲)

اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اونچی مت کرو اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح آواز دے کر پکارو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

فرمان نبوی

—''ایاکم والغلو فی الدین فانما ھلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین''(۱)

دین میں غلو سے بچو کہ تم سے پہلی قومیں دین میں غلو کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئیں۔

—''ان اھل قریظہ نزلوا علی حکم سعد،فارسل النبی الیہ،فجاء فقال:قوموا إلی سیدکم.....''(۲)

بنو قریظہ نے حضرت سعد کو حَکَم (ثالث) مان لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلا بھیجا

(۱) سنن النسائی، کتاب المناسک، باب التقاط الحصی

(۲) صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب قول النبی قوموا الی سیدکم

جب وہ آئے تو آپ ﷺ نے اہل مجلس سے کہا: اپنے سردار کے احترام میں کھڑے ہو جاؤ۔

س: بے ادبی کیا ہے؟

ج: بے ادبی کے کئی پہلو ہیں جن سے مل کر یہ ایک رویے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان پہلوؤں کی طرف ہم بعد میں جائیں گے پہلے اس کی ایک نسبتاً جامع تعریف وضع کر لینا مناسب ہوگا۔ بے ادبی کا مطلب ہے کسی شخص یا کسی چیز کو اس کے حقیقی مقام سے، جو شریعت اور معاشرے میں موجود اخلاقی اقدار کا دیا ہوا ہو، نیچے اتار دینا۔ اس کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص یا ایک چیز کی جو تعظیم ہم پر شرعاً یا اخلاقاً واجب ہے، وہ نہ کرنا۔ اب اس کے ان پہلوؤں کی طرف آتے ہیں جن کی طرف ابھی ہم نے اوپر اشارہ کیا تھا، بے ادبی کے کئی پہلو ہیں مثلاً:

۱۔ شریعت کو اپنی رائے کے تابع کرنا۔ اس میں پورا دین ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ خیال رہے کہ شریعت میں عقائد اور اعمال دونوں شامل ہیں۔

۲۔ احکام کی علانیہ خلاف ورزی کرنا۔

۳۔ دینی شعائر یا علامات کا استخفاف کرنا۔ دینی شعائر وغیرہ کی ایک صورت قانونی ہے اور دوسری اخلاقی ونفسیاتی۔ قانونی استخفاف واضح ہے، سمجھنے کی چیز اس کا نفسیاتی واخلاقی پہلو ہے۔ تقریباً تمام دینی شعائر یا علامات، قانون کے علاوہ مختلف قوموں کے عرف میں بھی تعظیم کی مخصوص صورتیں رکھتے ہیں۔ ان صورتوں کی خلاف ورزی، اگر شرعاً ضروری نہ ہو تو بھی بے ادبی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارا عرف یہ ہے کہ قرآن شریف کو نیچے نہ رکھو، اس کی طرف پشت نہ کرو، قبلے کی طرف پاؤں نہ پھیلاؤ۔ یہ اور اس طرح کے تمام امور اس مزاج کی تشکیل کرتے

ہیں جو شریعت کو مطلوب ہے، لہذا شریعت کی طرف سے تاکید نہ ہونے کے باوجود ان چیزوں کو عملاً رد کرنا یا طبعاً ان کے ساتھ مناسبت نہ رکھنا، بے ادبی ہی کہلائے گا اور موجودہ عرف میں رہتے ہوئے اس بے ادبی کا نقصان دینی ہی ہوگا۔

۴۔ دین کی بنیاد پر امتیاز رکھنے والے لوگوں کی اہانت یا دل میں ان کی تعظیم کا نہ ہونا۔ اس خرابی کا اظہار عام طور پر اسلاف کی بے توقیری کی شکل میں ہوتا ہے۔ جبکہ سلف صالح کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ تعظیم، احسان مندی اور محبت کے علاوہ نہیں ہوسکتا، اور اگر ہوگا تو غیر اسلامی اور غیر فطری ہوگا۔

۵۔ اپنے سے بڑوں کے سامنے کسی بھی وجہ سے گستاخانہ رویہ اختیار کرنا۔ ان میں والدین بھی آتے ہیں اور وہ تمام مسلمان بھی جو ہم سے مرتبے یا عمر میں بڑے ہوں۔

س: کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان تمام پہلوؤں کی چند ٹھوس مثالیں بھی بیان کر دی جائیں تاکہ بات ہر ذہنی سطح کے آدمی کی سمجھ میں آجائے؟

ج: بے ادبی کی چند صورتوں کی مثالیں یہ ہیں:

ا۔ شریعت کو اپنی رائے کے تابع کرنا جیسے:

— عقائد کو فلسفہ بنا دینا جیسے بعض متکلمین اور صوفیا نے کیا۔

— احکام کو توڑ مروڑ دینا جیسا کہ تمام گمراہ فرقوں کا خاصہ ہے، مثلاً یہ حکم فلاں وقت تک کے لیے تھا (جیسے جہاد کا حکم) یا اس کا مطلب امت آج تک نہیں سمجھی یہ نماز کا مطلب نظام ربوبیت کا قیام ہے یا قربانی صرف مکے کے لیے تھی یا بشری جہت سے، معاذ اللہ، ہم میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی فرق نہیں، یا ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی رائے کے برخلاف کوئی رائے رکھ سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

— قیاس واجتہاد کو غیر مشروط حجت بنا دینا، یعنی کسی امتی کی رائے کو ویسی ہی سند بنا لینا جیسی کہ قرآن وسنت کو حاصل ہے۔

— دین میں نئی باتیں پیدا کرنا اور ان کی اشاعت کی کوشش کرنا۔

— شریعت اپنے اندر ایک نظام ترجیحات رکھتی ہے، اس نظام میں بگاڑ پیدا کرنا۔
اس کی ایک مثال یہ ہے کہ شریعت کو اللہ کی مستقل یاد اور گناہ سے بچاؤ دونوں مطلوب ہیں، لیکن اگر ایک شخص ان دونوں بیماریوں میں مبتلا ہو تو شریعت پہلے قدم پر گناہ سے بچاؤ پر اصرار کرتی ہے اور ذکر الٰہی کی مختلف صورتوں مثلاً نوافل یا کثرت اعمال کو اس کے بعد رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں اکثر حلقوں میں یہ ترتیب الٹ گئی ہے۔ یہ ہے شریعت کے نظام ترجیحات میں خلل ڈالنا۔
شریعت کو اپنی تمام دینی، روحانی اور اخلاقی ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی نہ سمجھنا۔ آدمی خواہ اس کا اقرار کرے یا نہ کرے، اس کا عمل دیکھا جائے گا۔
احکام کی علانیہ خلاف ورزی کرنا۔ اس میں فسق و فجور کی تمام صورتیں آجاتی ہیں مثلاً ترک نماز، ترک صوم وغیرہ

۳۔ دینی شعائر و علامات کا استخفاف۔ یہ استخفاف قانونی بھی ہو سکتا ہے اور عرفی بھی۔

قانونی استخفاف کی چند مثالیں یہ ہیں: نماز کے لیے مسجد کو نہ جانا، استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا، خود داڑھی نہ رکھنا اور دوسرے کی داڑھی کو حقارت سے دیکھنا، اتباع سنت کی ظاہری صورتوں مثلاً مسواک وغیرہ کی طرف سے بے پروائی برتنا یا انہیں غیر ضروری سمجھنا یا کسی دوسرے میں ان کا اہتمام دیکھ کر ناپسندیدگی محسوس کرنا۔

عرفی استخفاف: اس کی مثالیں اوپر گزر چکیں۔ اس میں البتہ ایک بات ملحوظ رہے کہ امت میں عرف ایک نہیں ہے۔ ہر قوم اپنی بعض نفسیاتی اور معاشرتی قیود میں رہتے

ہوئے ایک خاص مزاج پیدا کر لیتی ہے جو دوسروں قوموں کے لیے بامعنی نہیں ہوتا۔ اس لیے عرفی بے ادبی کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے کہ اس میں پوری امت کو داخل کر دیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ ایک عمل ہمارے ہاں بے ادبی کا مظہر ہو لیکن عربوں میں ایسا نہ ہو، لہذا ضروری ہے کہ اپنے عرف کو معیار بنا کر ان کی تردید نہ کی جائے مثلاً قبلے کی طرف پاؤں دراز کرنا ہمارے مزاج کے مطابق ایک بے ادبی ہے لیکن عربوں کا ذہن اس طرح کا کوئی شائبہ تک نہیں رکھتا۔ انہیں اگر سمجھانا ہو تو پھر شرعی دلیل لانی پڑے گی۔ ہم اپنے عرف کو ان پر حجت نہیں بنا سکتے۔ اس چیز کا خاص خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اس میں غفلت کی وجہ سے ہمارے اکثر لوگ اہل عرب کے بارے میں بدگمانی سے بڑھ کر غیبت اور غیبت سے بڑھ کر بہتان تک پہنچ جاتے ہیں۔

س: بے ادبی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: بے ادبی سے جو نقصانات پہنچتے ہیں وہ بیک وقت شرعی و روحانی بھی ہیں اور اخلاقی ونفسیاتی بھی۔ آدمی ایک پہلو سے کسی ضروری حکم پر عمل سے قاصر رہ جاتا ہے یا شریعت کو بہت زیادہ مطلوب کسی فضیلت کے حصول سے محروم ہو جاتا ہے اور دوسری طرف چونکہ بنیادی طور پر یہ ایک رویہ ہے لہذا اس کی وجہ سے انسان کی باطنی ساخت بھی مجروح ہوتی ہے اور شریعت پر چلنے کے لیے جو داعیات ضروری ہیں وہ کمزور پڑ جاتے ہیں یا پیدا ہی نہیں ہوتے۔ غرض ہر جہت سے یہ رویہ مضر ہے اور اس سے پہنچنے والا ہر ضرر شخصیت کے بگاڑ میں ایک مجموعی اور کلی کردار رکھتا ہے۔ یعنی اگر بے ادبی طبیعت پر اثر انداز ہو تو اعمال عبودیت بھی متاثر ہو جاتے ہیں اور مخلوق کے حقوق بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس کا اثر ذہنی ہو تو آدمی میں وہ خودرائی پیدا ہو جاتی ہے جو اسے قرآن وسنت کی واقعی مراد سے منحرف یا دور کر

دیتی ہے۔ بے ادب آدمی ہر سطح پر اور ہر جہت سے چند ایسے نقائص میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اسے شریعت سے متعلق رہنے کے ابتدائی مراحل سے بھی دور کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے چند نقصانات درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت خطرناک حد تک کم ہو جاتی ہے۔

۲۔ سنگ دلی پیدا ہو جاتی ہے اور دل میں گداز کی کوئی صورت نہیں رہتی۔

۳۔ شریعت جس معاشرت کا مطالبہ کرتی ہے، بے ادب آدمی اس میں کبھی نہیں کھپ سکتا۔

۴۔ دین جس غیر مشروط اطاعت کا نام ہے، بے ادبی اس کی ضد ہے۔

۵۔ اچھے لوگوں کی دل آزاری، جو گناہوں میں ایک بڑا گناہ ہے، زیادہ تر بے ادبی کی وجہ سے سرزد ہوتا ہے۔

غلوّ ادب

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے، اور وہ یہ کہ جس طرح بے ادبی ایک بری چیز ہے، اسی طرح ادب میں غلو بھی مضر ہے۔ ادب میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ پیر، امام، استاد، افسر، ماں باپ یا کسی بھی شخص کو اپنے لیے اتنا مکرم و محترم بنا لینا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی ہونے لگے۔ مثلاً اکثر لوگ فرطِ ادب سے اپنے پیر کو ایسا سمجھنے لگتے ہیں کہ شرک کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دین میں سب سے بڑا نقصان ہے جو اس رویے سے لاحق ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بات بہت احتیاط سے سمجھ لینی چاہیے کہ حقیقی ادب اعتدال کا نام ہے، جو جس کا حق ہے اسے دو اور دوسرے مسلمانوں کو اپنے سے اچھا جانو۔ ادب کے تمام تقاضے یہاں پہنچ کر پورے ہو جاتے ہیں۔

س: بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ حبِ رسول ﷺ کی آڑ میں وہ ایسے اقوال وافعال کے مرتکب ہوتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی میں، نعوذ باللہ، بس نام کا فرق ہے۔ کیا یہ ادب میں غلو نہیں ہے؟

ج: شیطان نے ادب میں غلو کی جتنی صورتیں ایجاد کی ہیں، ان میں سب سے خطرناک صورت یہی ہے جو آپ کے سوال میں مذکور ہے۔ شرک و بدعت کے پھیلاؤ میں سب سے بڑا کردار اسی فریب کاری کا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا حوالہ آتے ہی مسلمان کی طبیعت اور ذہن میں غیر مشروط قبولیت کا دروازہ کھل جاتا ہے لہٰذا اس سے فائدہ اٹھا کر شیطان بہت سی ایسی باتیں بھی سجھا دیتا ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے معبود کے درمیان پائے جانے والے مطلق فرق کو یا تو ختم کر دیتی ہیں یا محض برائے نام باقی رکھتی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس معاملے میں خود رسول اللہ ﷺ کے واضح ارشادات کی پابندی بھی نہیں کرتا۔ رسول اللہ ﷺ کے سلسلے میں ادب میں غلو کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں مبتلا شخص جس کا ادب کرتا ہے، اس کی اتباع نہیں کرتا۔ دراصل اس طرح کے تمام رویے بے ادبی ہی کی صورتیں ہیں۔ انہیں ادب سے کوئی نسبت نہیں، کیونکہ ادب اظہارِ محبت ہی نہیں بلکہ اتباعِ حکم کا بھی نام ہے۔ تاہم اللہ معاف فرمائے، اس معاملے میں بہت بڑی احتیاط درکار ہے۔ یہاں غلو بھی کفر تک پہنچا دیتا ہے اور ذرا سی بے ادبی کا بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

س: رسول اللہ ﷺ کے ادب میں جھوٹے غلو کی بات تو سمجھ میں آ گئی لیکن یہ جاننا بھی درکار ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کی شان میں بے ادبی کی کیا کیا صورتیں ہیں؟ ان کا بیان بھی ہو جائے تو خاصی آسانی ہو جائے گی؟

ج: اللہ تعالیٰ کی جناب میں بے ادبی کا رویہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی محبت کے نام پر، کبھی خوف کے نام پر اور کبھی معرفت کے نام پر۔ اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت پر ایسا اصرار کہ اس کا رعب اور جلال ملحوظ نہ رہے۔ اس مرض میں مبتلا آدمی، اللہ سبحانہ کو بھی گویا اپنی سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ بے ادبی کا خلاصہ یہی تو ہے کہ چھوٹا بڑے تک پہنچنے کی کوشش کرنے کی بجائے اسے اپنی سطح پر لانے کی خواہش کرے۔ یہ خرابی ہماری شاعرانہ اور صوفیانہ روایت کے بڑے حصے میں موجود ہے۔

۲۔ اللہ سے ڈرنے کی ایسی صورتیں فرض کر لینا کہ اپنی نجات و بخشش سے مایوس ہو جانا۔ یہ بھی بے ادبی ہے کیونکہ اس میں رحمت الٰہیہ کا ایک ایسا تصور کارفرما ہے جس کی نسبت اللہ کی طرف کرنا اس کی توہین ہے۔

۳۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اللہ کے کچھ راز ہیں جنہیں اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور نہ کوئی جان سکتا ہے۔ ان رازوں تک پہنچنے کا دعویٰ اور کوشش و خواہش بھی بے ادبی ہے۔ ایسا آدمی گویا اللہ کے قول پر یقین نہیں رکھتا کہ اللہ تو ایک چیز کو محال فرما رہا ہے اور یہ اس کے حصول کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

۴۔ بعض اہل علم تاویل کے خطرات کو بھانپ کر ذات وصفات الٰہیہ کے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہیں جن سے کوئی بڑا عیب اللہ سے منسوب ہو سکتا ہے مثلاً اللہ کے لیے جسم اور جہت وغیرہ ماننا یا کوئی ایسا عقیدہ رکھنا جس سے یہ خرابیاں لازم آتی ہوں۔ یہ بھی بے ادبی کی ایک قسم ہے اور آدمی کو دین سے خارج کر سکتی ہے۔

۵۔ راحت میں شکر اور مصیبت میں صبر نہ کرنا۔ یہ بے ادبی کی وہ قسم ہے جو مسلمانوں

میں سب سے زیادہ عام ہو چکی ہے۔ کوئی کامیابی ہوتی ہے تو اس پر خود کو شاباش دی جاتی ہے یا کسی انسان کی توجہ، تصرف وغیرہ کا نتیجہ سمجھ لی جاتی ہے اور جس کے حکم سے یہ کامیابی ہوئی ہے، اسے بالکل فراموش کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی مصیبت آتی ہے یا دعاؤں کے باوجود نہیں ٹلتی تو اللہ کی شکایت تک پر اتر آتے ہیں۔

۶۔ واضح احکام میں چوں چرا کرنا۔ یہ بھی بے ادبی کی وہ قسم ہے جو بہت عام ہے، لہذا یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ عقیدے اور عمل میں اللہ تعالیٰ کے احکام وارشادات کی خلاف ورزی کی ہر قسم بے ادبی ہے۔

۷۔ اللہ سے براہِ راست تعلق نہ رکھنا اور اس میں کسی غیر نبی کی اجارہ داری کو فرض کر لینا، یہ بے ادبی کی وہ قسم ہے جو ایسے آدمی سے سرزد ہوتی ہے جس کا ایمان ابھی ناقص ہے اور اس کے دل میں شرک کے کچھ جراثیم پائے جاتے ہیں۔

۸۔ نتائج پیدا کرنا صرف اور صرف اللہ کا اختیار ہے۔ یہ نتائج چاہے دنیوی ہوں یا اخروی، ان کو حاصل کرنے کے لیے کسی مخلوق کو پکارنا یا اس کے بارے میں یہ گمان رکھنا کہ وہ چاہے تو فلاں چیز ہو جائے گی یا فلاں چیز نہیں ہوگی یا وہ چاہے تو اللہ سے اپنی بات منوا سکتا ہے، اس طرح کے معتقدات گویا بے ادبی کی پرورش گاہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس سے بڑھ کر توہین کیا ہو سکتی ہے کہ جس قدرت و اختیار کو اس نے اپنے لیے واضح طور پر خاص کر رکھا ہے اس میں کسی دوسرے کو شریک کر لیا جائے۔ عام طور پر شیطان اس خرابی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دے کر مبتلا کرتا ہے۔

س: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں بے ادبی کی بھی مثالیں دے دی جائیں تا کہ

بات بالکل واضح ہو جائے۔

ج: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی کے ارتکاب کی دو صورتیں ہیں: ایک ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی اور دوسرے احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی۔ ان کی ضروری تفصیل یہ ہے کہ بعض لوگ آپؐ کے احکام پر پوری طرح چلنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس جوش اتباع میں آپؐ کی ذات اقدس کا ضروری ادب نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متبوع تو ہیں مگر مطلوبہ حد تک محبوب نہیں۔ دوسری قسم کی بے ادبی کے مرتکب وہ لوگ ہیں جو محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مدعی بن کر جوش محبت میں احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف یہ کہ فراموش کر دیتے ہیں بلکہ ان کی صریح خلاف ورزی میں بھی انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی نظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب تو ہیں مگر متبوع نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ادب امت پر واجب ہے وہ شدید ترین محبت اور غیر مشروط اور بلا تاویل اتباع کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی کم رہ جائے تو اس ادب کا بنیادی تقاضا فوت ہو جائے گا۔ بے ادبی کی ان دونوں قسموں کے کچھ مظاہر یہ ہیں:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر ایسا اصرار کرنا جس کے نتیجے میں رسول کی حیثیت سے آپؐ کا حقیقی امتیاز کمزور پڑ جائے۔ اس خیال کے حاملین کی پہچان یہ ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اثبات نقائص بشری کی روشنی میں کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ بشریت ہمارے لیے تو موجب نقائص ہو سکتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے یہ سراسر کمال ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بے لچک اور ٹھنڈے قانونی تعلق پر قانع ہو جانا اور آپؐ کی طبعی پسند ناپسند وغیرہ سے کوئی مناسبت محسوس نہ کرنا۔ اس طرح کا آدمی

محبت رسول ﷺ کے شرعی تقاضے کی تکمیل کے قابل نہیں رہتا۔

۳۔ آپ ﷺ کو محبوب بنا کر خدا کے مقابلے میں لے آنا اور آپ ﷺ کے اظہار بندگی کو کوئی اہمیت نہ دینا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اوقات جہاں ہیبت وجلال کے ساتھ آپ ﷺ کو مخاطب فرمایا ہے، ان خطابات کا ترجمہ یا تفسیر کرتے وقت مراد کو بالکل بدل دینے کی جسارت کرنا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو، نعوذ باللہ، اللہ کو بھی اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے مودب رہتا ہے۔ اس خرابی کی بہت سی مثالیں ہمارے معاشرے میں بکثرت موجود ہیں اور عوام تو عوام کئی علما وصوفیا بھی اس میں مبتلا ہیں۔

۴۔ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کی حدود کو اتنا بڑھا دینا کہ اللہ کا اقتدار اور خود آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کا نظام جزا وسزا بے معنی ہو کر رہ جائے۔

یہ اور ان سے ملتی جلتی دیگر چیزیں رسول اللہ ﷺ کی شدید توہین کے مترادف ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے محفوظ رکھے۔

س: بے ادبی کا علاج کیا ہے؟

ج: بے ادبی کے رویے اور عمل سے نجات کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کی جائیں تو ان شاء اللہ مفید ہوں گی:

۱۔ نماز میں ظاہری حسن پیدا کرنا، جس کے ضروری اجزاء یہ ہیں: قیام میں تھوڑا سا جھک کر کھڑے ہونا، کوشش کرنا کہ پوری نماز میں نماز کی حرکات کے علاوہ جسم حرکت نہ کرے اور نسبتاً لمبے رکوع وسجود کرنا۔ یہ چیزیں آدمی میں بندگی کی قوت اور کیفیت میں اضافہ کرتی ہیں جو بے ادبی کے علاج میں سب سے زیادہ ضروری ہیں۔

۲۔ سیرت النبی ﷺ اور صحابہؓ کے سوانح کا بکثرت مطالعہ، اس سے ادب کا ایک زندہ

ماڈل سامنے آجاتا ہے جو انتہائی محفوظ بھی ہے۔

۳۔ کسی دین دار آدمی سے اپنی اصلاح کا تعلق پیدا کرنا اور اس کے مشوروں پر، بلا ضرورت شرعی، تنقیدی نظر نہ ڈالنا۔ اس سے وہ ادب پیدا ہوتا ہے جو شریعت کو مختلف المراتب انسانوں کے درمیان مطلوب ہے۔

۴۔ خدمت خلق۔ اس سے ایک طرف تو خود غرضی اور خود پسندی کا ازالہ ہوتا ہے اور دوسری جانب نیکی کا ایک وسیع اور متنوع تصور پیدا ہوتا ہے۔ بے ادبی کے خاتمے کے لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

۵۔ گاہے بگاہے کچھ ایسی چیزیں سننا جو دل اور طبیعت پر اثر کرتی ہوں مثلاً اچھی قرأت، کوئی محفوظ کلام لحن کے ساتھ، کوئی وعظ وغیرہ۔

۶۔ جن چیزوں سے نشاط طبع پیدا ہوتی ہے انہیں معمول بنانا: مثلاً باغ کی سیر، کوئی کھیل وغیرہ، کیونکہ بے ادب آدمی طبیعت میں بند اور خشک ہوتا ہے۔ عام طور پر ہشاش بشاش رہنے والا شخص بے ادب نہیں ہوتا۔

س: آپ کی اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسن ادب اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے؟

ج: آپ ٹھیک سمجھے۔ حسن ادب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کا حق نہیں ادا کر رہے تھے تو خود اللہ تعالیٰ نے مداخلت فرمائی اور صحابہ کو سکھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کیسے کرنی چاہیے (الحجرات ۴۹: ۲، ۴)۔ اسی طرح گھروں میں پرائیویسی (النور ۲۴: ۵۸)، گھر سے باہر عورتوں کے لباس (الاحزاب ۳۳: ۵۹)، میاں بیوی کے باہمی تعلقات (النساء ۴: ۳۴) اور دوسرے بہت سے معاملات میں قرآن نے مسلمانوں کو آداب سکھائے۔ اور آداب کے

سلسلے میں آنحضرت ﷺ کی تعلیمات تو اتنی وسیع ہیں کہ مسلمانوں کے علاوہ، کافروں، جانوروں، پرندوں، لباس، سفر، طعام، سلام، مجلس غرض زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے بارے میں آپ ﷺ نے اتنی تفصیلی رہنمائی دی ہے کہ اسلامی اخلاقیات (جو ایک چوتھائی دین ہیں —— کہ عام طور پر دین کو عقائد، اخلاق، عبادات اور معاملات چار شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے) کا بہت بڑا حصہ آداب ہی پر مشتمل ہے۔ لہذا اسلامی آداب کو محض دنیوی ایٹی کیٹس (Etiquettes) کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ تو جزو دین ہیں اور ہم ان پر عمل کے مکلّف ہیں اور روز قیامت ان پر جزا اور سزا کا نفاذ ہوگا۔

❂❂❂

بدعت

حکم ربّانی

—﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ......﴾(النساء۴:۵۹)

پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔

—﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ﴾(یونس۱۰:۳۲)

پھر حق بات معلوم ہو جانے کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی کے سوا اور کیا ہے؟

فرمان نبوی

—''......اِن خیر الحدیث کتاب اللّٰہ وخیر الھدی ھدی محمد ﷺ وشر الامور محدثاتھا وکل بدعة ضلالہ''(۱)

یقیناً بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے اور بدترین کام دین میں نئے پیدا کردہ کام ہیں اور (ایسا) ہر نیا کام (بدعت) گمراہی ہے۔

—''من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد''(۲)

جس نے ہمارے دین میں نئی بات کا اضافہ کیا وہ رد کر دی جائے گی۔

س: بدعت کی تعریف کیا ہے؟

ج: جو چیز دین نہیں ہے اسے دین بنا لینا۔ یہ عمل خواہ واضح اور علانیہ ہو یا اشارۃً اور کنایۃً، بدعت ہے۔ فہم اور تعبیر کی غلطیاں اور ان پر عقیدہ و عمل اس تعریف سے خارج ہے۔ گویا بدعت یہ ہے کہ آدمی یہ جاننے کے باوجود کہ فلاں خیال یا عمل قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے؛ اس خیال اور عمل کو دین بنا کر اختیار کرے اور

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، باب تخفیف الصلاۃ و الخطبہ

(۲) صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب اذا اصطلحوا علی صلح جور

ج: دین ہی کی حیثیت سے اس کی تعلیم دوسروں کو دے اور اس کی مخالفت کے جواب میں وہی رویہ اپنائے جو دین کی مدافعت میں اپنایا جاتا ہے۔ تعبیر کی غلطی کسی غلط دلیل کی بنا پر ہوتی ہے جو صحیح دلیل ملنے پر چھوڑ دی جاتی ہے، لیکن اوپر کی تفصیل کے مطابق بدعت کا یہ معاملہ نہیں ہے۔

س: اگر آپ چند مثالیں دیں سکیں تو بات مزید واضح ہو جائے گی؟

ج: وہ افکار و خیالات اور رسوم و اعمال جن کے بدعت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ وجود باری تعالیٰ پر فلسفیانہ بحث کرنا مثلاً ذات و صفات کی عینیت و غیریت کا مسئلہ، مراتب الٰہیہ کا مبحث، اللہ تعالیٰ کے قدیم ہونے کی توجیہہ، اللہ کے لامحدود ہونے کی توضیح علم الٰہیہ کی تفصیل وغیرہ۔

۲۔ مسئلہ تقدیر کی حقیقت جاننے کی کوشش کرنا۔

۳۔ متشابہات کی قطعی تفسیر کرنا

۴۔ جنت و دوزخ کو مقامات کی بجائے احوال یا علامات سمجھنا

۵۔ شفاعت کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ رسول اللہ ﷺ ہماری ہر طرح کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیں بخشوالیں گے۔

۶۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تمام صحابہ سے افضل سمجھنا

۷۔ کسی شخص کی غیر مشروط پیروی کرنا

۸۔ اولیاء اللہ کے لیے یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ گناہوں اور غلطیوں سے محفوظ ہیں۔

۹۔ قبروں پر منتیں ماننا اور صاحب قبر کو نہ صرف یہ کہ یقین سے زندہ سمجھنا بلکہ اسے متصرف بھی جاننا۔

۱۰۔ کسی بزرگ کے مزار سے ملحقہ مسجد کو دوسری مساجد پر ترجیح دینا۔ ویسے بھی چار مسجدوں، مسجد حرام، مسجد نبوی ﷺ، مسجد اقصیٰ اور مسجد قباء کو چھوڑ کر کسی مسجد کو دوسری مساجد سے افضل نہیں کہا جا سکتا۔

۱۱۔ موجودہ زمانے میں پیری مریدی کی اکثر صورتیں مثلاً پیر کے ادب میں غلو کرنا، اس کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھنا، اسے غیب دان ماننا، اس کی ہر دعا کو یقیناً مستجاب سمجھنا، اس کے لیے بڑے بڑے القابات کا استعمال مبالغے کے ساتھ کرنا، بزرگوں کے عرس کو میلے کی شکل میں منانا اور اس میں شرکت کو باعث ثواب جاننا، قبروں پر چادریں چڑھانا، چراغ جلانا، وہاں بیٹھ کر قرآن پڑھنا، قبر کو بوسہ دینا، برکت کے لیے اسے ہاتھوں سے سینے یا رخسار سے مس کرنا، ان کا طواف کرنا وغیرہ۔

۱۲۔ قبروں کو پختہ اور بلند کرنا

۱۳۔ عورتوں کا اپنے پیر کے سامنے بے پردہ ہونا۔

۱۴۔ قبروں پر سجدہ کرنا، خواہ اسے سجدۂ تعظیمی ہی کیوں نہ سمجھیں۔

۱۵۔ صوفیاء کے تجویز کردہ اعمال و اشغال کو قولاً یا فعلاً دینی درجہ دینا، یعنی ان کی وہی حیثیت جاننا جیسی کہ قرآنی اور مسنون اوراد و اذکار کی ہے یا ان میں ایسا انہماک کہ ذکر و عبادت کی مسنون صورتوں پر عمل کی مقدار کم ہو جائے یا ختم ہو جائے۔

۱۶۔ تزکیۂ نفس کے نام پر صرف وہی ذرائع اختیار کرنا جو خود ساختہ ہیں۔ مطلب یہ کہ مسنون زندگی گزارتے ہوئے معالجے کے طور پر تزکیے کے کچھ وسائل اختیار کیے جا سکتے ہیں، بلکہ غور سے دیکھیں تو بعض شریعت کی رو سے ضروری بھی ہیں تاہم ان کا تناسب اور مرتبہ شرعی اعمال کے مقابلے میں کم اور ثانوی ہونا چاہیے۔

۱۷۔ محافل میلاد میں قیام کو فرض یا واجب سمجھنا......وغیرہ۔

س: ان میں سے بعض امور صریحاً کفر و شرک معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں بدعت کہہ کر آپ کہیں ان کی خرابی کو ہلکا تو نہیں کر رہے؟

ج: نہیں، یہ بدعتیں ہی ہیں کیونکہ کفر و شرک کے لیے ارادۂ کفر و شرک ضروری ہے۔ یہ افعال اور ان کا نتیجہ ضرور کفریہ اور مشرکانہ ہو سکتا ہے لیکن ان کے مرتکب کو کافر اور مشرک اس وقت تک نہیں کہنا چاہیے جب تک وہ کفر و شرک کا خود اقرار نہ کر لے یعنی یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کا ارادہ ہی شرک اور انکارِ دین کا تھا۔ لیکن یہ بات انہی یا ان جیسے اعمال تک محدود ہے ورنہ ٹھیٹھ کفر و شرک میں ارادہ نہیں دیکھا جائے گا۔

س: وجودِ باری تعالیٰ پر عقلی مباحث کو بدعت کہنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ تقریباً تمام متکلمین اور اکثر صوفیا بدعت کے مرتکب تھے؟

ج: وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات یا تجزیے میں عقل، قیاس، تخیل، کشف وغیرہ کو حَکَم بنانا اور بعض متعینہ اصطلاحات میں گفتگو کرنا یقیناً بدعت ہے۔ تاہم ہماری روایت میں یہ کام ضرورتاً زیادہ ہوا ہے مثلاً مخاطبین ہی ایسے تھے کہ اس طرح کا انداز ناگزیر ہو گیا تھا یا پھر عیسائیوں وغیرہ کے اعتراضات نے ایمانیات کو عقل کی روشنی میں ثابت اور واضح کرنے پر مجبور کر دیا۔ مختصر یہ کہ کسی تبلیغی اور تعلیمی مصلحت سے تو ایسے کام ایک محدود معنی میں روا سمجھے جا سکتے ہیں لیکن انہیں بلاضرورت خود مسلمانوں میں رائج کرنا بہرحال بدعت ہی محسوس ہوتا ہے۔

س: بدعت کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: ایک مسلمان کا اس سے بڑا اور کیا نقصان ہو سکتا ہے کہ وہ دین سے دور جا پڑے۔

دین کے قانونی دائرے میں رہتے ہوئے اس سے دوری بلکہ محرومی کا سب سے بڑا سبب یہی بدعت ہے۔اس کا دوسرا بڑا ضرر نقص ایمان ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ بدعت کا شکار شخص ایمان میں کامل ،صادق اور مضبوط ہو۔تیسرا نقصان عمل کا ہے۔دین میں عمل کی تعریف یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ کی خوشنودی اور جنت حاصل ہو جب کہ بدعت جن اعمال کا نام ہے وہ ازروئے نص جہنم میں لے جانے والے ہیں۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ دین میں ہر نئی بات مردود ہے (۱) یہ بدعت ہے اور ہر بدعت کا نتیجہ گمراہی ہے،اور ہر گمراہی کا (آخری) نتیجہ دوزخ ہے (۲)۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ محدثات وبدعات کا مرتکب حشر کے روز حوض کوثر کے پانی سے محروم رہے گا (۳) اور اس کا نماز ،روزہ ،حج اور کوئی نیکی بھی قبول نہ ہوگی (۴)۔گویا اس نقصان کو آخرت کا نقصان کہنا چاہیے بدعتی اللہ کی رحمت ،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اور آخرت کی خوشحالی سے محروم ہو جاتا ہے۔اس سے بڑے نقصان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اہل بدعت جس چیز کی سب سے زیادہ آڑ لیتے ہیں وہ محبت ہے یعنی اللہ سے محبت ،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت یا کسی اور برگزیدہ ہستی سے محبت۔ شیطان ان سے محبت کے نام پر اس طرح کھیلتا ہے کہ انہیں اتباع اور اطاعت ،جو کُل شریعت ہیں ،کی مخالف سمت میں کھڑا کر دیتا ہے۔جس کسی کو یہ کہتے سنو کہ ہم اللہ کے طالب ہیں ،جنت کے نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعظیم کے طریقے اپنے مرتبے کی بلندی بر بنائے تواضع بیان نہیں کی تو یقین سے سمجھ لو کہ یہ شخص بدعتی

۱۔صحیح بخاری، کتاب الصلح ،باب اذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود

۲۔سنن ابن ماجہ، کتاب السنہ ،باب اتباع سنة الخلفاء الراشدین المھدیین

۳۔صحیح بخاری، کتاب الرقاق ،باب الحشر

۴۔سنن ابن ماجہ، کتاب السنہ ،باب اجتناب البدع و الجدل

ہے اور کفر کے اتنا نزدیک پہنچ چکا ہے کہ شریعت کو آج نہیں تو کل نامکمل ضرور کہے گا۔

۳۔ مبتدع اپنی رائے اور خواہش کو حکم شریعت پر غالب کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ یہ خرابی روح بندگی کو مار دیتی ہے۔

۴۔ اہل بدعت دراصل دین کے تسلسل میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور یہ کھلم کھلا دشمنی ہے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ۔ اس کا عنوان جو چاہے رکھ لیں لیکن اپنی تاثیر اور نتائج کے اعتبار سے اسے دشمنی ہی کہا جائے گا، یعنی بدعتی گروہ دین کو صحیح صورت میں آگے منتقل ہونے نہیں دیتا۔ یہ اسلام کے تاریخی وجود سے کھیلنے کے مترادف ہے۔

س: بدعت کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا علاج اصولاً ایک ہی ہے اور وہ ہے تمسک بالقرآن والسنہ۔ بدعت کے ازالے کا اس کے سوا اور کوئی نسخہ نہیں۔ تمسک بالقرآن والسنہ کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں درکار ہیں:

۱۔ دین سارے کا سارا قرآن وسنت میں بند ہے۔ اس سے باہر جو کچھ ہے وہ دین نہیں۔ اس عقیدے پر ہر حال میں استقامت درکار ہے۔

۲۔ دین کے نام پر پھیلائی جانے والی ہر نئی صورت اور نئی بات سے بچنا، چاہے اس میں اپنی دانست میں کسی ایسی چیز کا نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے جس کا ہونا خود دین میں پسندیدہ ہو۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ قرآن وسنت سے باہر کسی خیال، کسی عمل، کسی تصور کو دین نہیں ماننا چاہیے، چاہے وہ ثابت شدہ مقاصد دین کی تکمیل ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ بدعات کا فروغ اصل میں اسی اصول کو فراموش

کرنے سے ہوتا ہے کہ کسی غیر نبی کا صحیح قول بھی دینی حجت نہیں ہے یعنی اس کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اس سے اختلاف کرنے والا آخرت میں خطرے سے دوچار ہو جائے۔ اس ضابطے کو سختی سے ملحوظ رکھنا چاہیے تاہم اتنی فراست ضرور درکار ہے کہ دین کی صحیح تعبیرات کے دین ہونے کا انکار تو صحیح ہے مگر ان کی صحت کی نفی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بے عقلی کا کام ہوگا جو شریعت میں پسندیدہ نہیں۔

❖❖❖

تجسّس

حکم ربّانی

— ﴿ ......وَلَاتَجَسَّسُوْا...... ﴾ (الحجرات ۴۹/۱۲)

ٹوہ مت لگاؤ (یعنی مسلمانوں کے عیبوں اور کمزوریوں کو تلاش مت کرو)۔

— ﴿ وَالَّذِيْنَ يُوْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴾ (الاحزاب ۳۳/ ۵۸)

اور وہ لوگ جو بغیر قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، پس انہوں نے یقیناً بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔

فرمان نبوی

— ''اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ، وَلَاتَحَسَّسُوْا، وَلَاتَجَسَّسُوْا وَلَا تَنَافَسُوْا......'' (۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ اور نہ جاسوسی کرو اور نہ دوسرے کا حق غصب کرنے کی حرص اور اس کے لئے کوشش کرو......''

— ''اِنَّكَ اِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ اَفْسَدْتَهُمْ......'' (۲)

اگر تو مسلمان بھائیوں کے عیبوں کی تلاش میں رہے گا تو تو ان کے اندر بگاڑ پیدا کر دے گا۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البرّ، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب النھی عن التجسس

س: تجسّس کی تعریف؟

ج: کسی کی ٹوہ میں رہنا اور جن چیزوں کو کوئی آدمی چھپانا چاہتا ہے انہیں جاننے کی کوشش کرنا تجسّس ہے۔

س: تجسّس کا داعیہ پیدا کس طرح ہوتا ہے؟

ج: تجسّس دراصل عیب جوئی کا نام ہے۔ اس کے پیچھے دوسروں کی خامیاں، کوتاہیاں اور معائب جاننے کی خواہش کارفرما ہوتی ہے۔

س: حکومت کے لیے دشمنوں، مجرموں، قانون شکنوں وغیرہ کی سرگرمیوں کا کھوج لگانا اور ان کے پوشیدہ ٹھکانوں پر حکومتی اہل کاروں کا چھاپہ مارنا۔ یہ باتیں تجسّس کے زمرے میں آتی ہیں یا نہیں؟

ج: اس میں ایک اصول ہے، اور وہ یہ کہ بعض خرابیاں اور گناہ انفرادی ہوتے ہیں اور ان کا نقصان بھی اسی شخص کو پہنچتا ہے جو ان کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس طرح کی صورتحال میں سوال میں مذکور چیزیں تجسّس کی ذیل میں آسکتی ہیں۔ تاہم بعض سرگرمیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا ضرر اجتماعی ہوتا ہے مثلاً زنا، جوا، مجرمانہ منصوبہ بندی، سازش وغیرہ۔ ان کی طرف سے باخبر رہنے اور ان کو پھیلنے سے روکنے کی ہر کوشش، خواہ حکومتی سطح پر ہو خواہ غیر سرکاری سطح پر، جائز بلکہ ضروری ہے مثلاً ایک آدمی اپنے گھر میں چھپ کر اگر شراب پی رہا ہو تو اسے پکڑنے کی کوئی بھی کوشش ٹھیک نہیں البتہ اگر یہی شخص خفیہ طور پر شراب بنانے کا کام کرتا ہو تو اس کا سراغ بھی لگانا چاہیے اور اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کاروائی بھی کی جانی چاہیے۔ حکومت کا معاملہ ایک خصوصیت رکھتا ہے کہ وہ حسبِ ضرورت سراغ رسانی کا اختیار استعمال کرسکتی ہے۔ اسے غالباً شرعاً چیلنج نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے تجسّس کہا جائے گا۔

س: تجسّس کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: تجسس کے چند بڑے نقصانات یہ ہیں:

ا۔ طبیعت میں پستی، بے حمیتی اور بے حیائی پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۔ مردوں میں یہ عادت بڑے بڑے مردانہ اوصاف کو کم یا ختم کر کے ایک گھٹیا قسم کا زنانہ پن پیدا کر دیتی ہے۔

۳۔ سوچ منفی ہو جاتی ہے۔

۴۔ تجسّس کی طرف میلان سے غیبت، بہتان اور عیب جوئی کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔

۵۔ لوگوں میں رسوائی ہوتی ہے اور معاشرہ ایسے شخص کو اپنے میں سے خارج کر دیتا ہے۔

۶۔ اس عادت کی وجہ سے بعض مرتبہ وہ چیزیں بھی دیکھنے سننے میں آ جاتی ہیں جنہیں کوئی غیرت مند آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔

۷۔ کسی پر بھی اعتماد باقی نہیں رہتا۔

۸۔ دل ہر قسم کی محبت سے خالی ہو جاتا ہے۔

۹۔ جھوٹ اور فریب سازی کی عادت پڑ جاتی ہے۔

۱۰۔ یہ ایک عمل آنکھ، کان، زبان حتی کہ تمام جوارح کو الگ الگ گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔

۱۱۔ تجسّس اور چوری کے امراض ایک ہی طرح کی نفسیات سے پیدا ہوتے ہیں۔ محض اس بات سے اس کے گھٹیا پن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ مسلمان کی پردہ دری ایک بہت بڑا گناہ ہے(۱) لہذا تجسّس کی عادت سخت مضر

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب الستر علی المومن

ہے، دینی لحاظ سے بھی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی۔

تجسس کے ان ہی نقصانات کی وجہ سے قرآن وسنت نے تجسّس کی مذمت کی ہے اور اسے شدت سے منع کیا ہے، دیکھیے (الحجرات ۴۹:۱۲، وصحیح بخاری (۱)

س: اس عادت کا علاج کیا ہے؟

ج: اس علاج کے اہم نکات یہ ہیں:

— ایسے صالح لوگوں کی صحبت اختیار کرنا جو باتیں کم کرتے ہوں لیکن ان کے اعمال کو دیکھ کر یا ان میں شریک ہو کر آدمی اپنے اندر مثبت تبدیلی کی ایک لہر محسوس کر سکتا ہو۔

— قرآن وحدیث میں تجسّس کی مذمت میں جو باتیں آئی ہیں ان کی تفسیر پڑھنا اور سننا۔

— جس کے لیے تجسّس کا داعیہ پیدا ہو، اسے اس داعیے سے مطلع کر دینا۔

— مَردوں کا عورتوں کی صحبت سے بچنا۔

— پراسرار قسم کے لوگوں کے ساتھ تعلق نہ رکھنا، کیونکہ ایسے لوگ تجسّس کے جذبے کو ہوا دیتے ہیں۔

— کسی کے ساتھ مقابلے کی فضا نہ پیدا ہونے دینا۔

— اپنے جاننے والوں کی غائبانہ تعریف کرنے کی عادت ڈالنا۔

— اگر گفتگو کے دوران میں آنکھ نیچی رکھنے کی عادت ہو تو اس کو ترک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ عادت بیشتر انہی لوگوں میں ہوتی ہے جو دوسروں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ البتہ طبیعت میں حیا کا غلبہ ہو تو دوسری بات ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، ماینھی عن التحاسد والتدابر

اِسراف

حکم ربّانی

—﴿ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا، اِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾

(الاعراف ۷:۳۱)

کھاؤ پیو مگر فضول خرچی نہ کرو کہ اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

—﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا، وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾

(الفرقان ۲۵:۶۷)

اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ کفایت شعاری اختیار کرتے ہیں۔

فرمان نبوی

—''ان النبی ﷺ مرّ بسعدٍ وهو يتوضأ فقال: ماهذا السرف ياسعد؟ فقال أفي الوضوء سرف؟ قال: نعم، وإنْ كنت على نهرجارٍ''(۱)

حضرت سعدؓ وضو کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ پاس سے گزرے اور کہا: سعد فضول پانی ضائع نہ کرو۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا وضو میں زیادہ پانی خرچ کرنا بھی فضول خرچی ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! خواہ تم دریا کے کنارے بیٹھ کر ہی وضو کیوں نہ کر رہے ہو!

—''من بذّر حرمه الله''(۲)

جو فضول خرچ کرتا ہے اللہ اسے اس سے محروم کر دیتا ہے۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب ماجاء فی القصد فی الوضوء......

(۲) مسند الشہاب عن منہاج الصالحین، ص ۳۰۹

س: اِسراف کی تعریف؟

ج: اِسراف عرف عام میں فضول خرچی کو کہتے ہیں لیکن اپنی اصل میں یہ ایک باطنی خرابی ہے جو آدمی کو مالی و غیر مالی امور میں شریعت کی مقرر کردہ حدود میں نہیں رہنے دیتی۔ یعنی صحیح معنوں میں اسراف کا مطلب ہے حد سے تجاوز کرنا۔ مالی امور میں اسراف کا مطلب وہ خرچ ہے جس کا کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہ ہو اور جو محض اپنے نفس کی خواہش پر اور اپنے نفس کی راحت کے لیے کیا جائے۔ ضرورت مندوں کی امداد میں خرچ کی کوئی واضح حد نہیں ہے۔ اس میں دل کھول کر خرچ کرنا انفاق ہے، اسراف نہیں۔

س: اِسراف کی صورتیں کیا ہیں؟

ج: اسراف کی معروف صورتیں یہ ہیں:

— جائیدادیں بنانا اور بڑے بڑے گھر تعمیر کرنا۔

— اپنی ملکیت میں فضول چیزوں کا اضافہ کرتے رہنا جو دینی طور پر مضر اور دنیاوی طور پر لغو ہوں۔

— محض اپنی ناموری کے لیے غیر مستحق لوگوں کو بڑے بڑے تحفے دینا۔

— شادی بیاہ اور دیگر معاشرتی رسوم میں ہونے والے بیشتر مروجہ اخراجات۔

— اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی بے لگام خواہش کی تکمیل کے ذرائع پیدا کرنا۔

س: اسراف کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: ہر خرابی کی طرح اسراف کے ظاہری نقصانات بھی ہیں اور باطنی بھی مثلاً:

۱۔ افلاس

۲۔ بلاوجہ مقروض ہونا

۳۔ دکھاوے کے مرض میں مبتلا ہونا یعنی خود نمائی

۴۔ حبّ دنیا اور حبّ مال

۵۔ شریعت کی پسندیدہ زندگی سے بالکل دوری

۶۔ اللہ واللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے مستقل غفلت

۷۔ نفسانیت اور ہوی پرستی

۸۔ انسانی مراتب اور فضائل کا عملی انکار

۹۔ دین اور دینی شعائر سے بے رغبتی

۱۱۔ آخرت کی فکر کا خاتمہ

۱۲۔ حصول مال کے لیے ناجائز ذرائع ڈھونڈنا۔

اسراف کی انہی خرابیوں کی وجہ سے قرآن حکیم میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتا (الاعراف ۷:۳۱)، انہیں ہدایت نہیں دیتا (مومن ۴۰:۲۸)، وہ شیطان کے بھائی ہیں (بنی اسرائیل ۱۷:۲۷) اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے (مومن ۴۰:۴۳) اور مومنوں کی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی بخل بلکہ معتدل رویہ رکھتے ہیں (الفرقان ۲۵:۶۷) اور نبی کریم ﷺ نے اسراف سے بچنے کی تعلیم دیتے ہوئے اپنے اصحاب (اور امت) کو سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے اور ریشمی لباس پہننے سے منع فرمادیا (۱) اور ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعدؓ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: وضو میں اسراف سے کام نہ لو۔ حضرت سعدؓ نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ) کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! خواہ تم دریا کے کنارے ہی وضو کیوں نہ کر رہے ہو؟ (۱)

۱۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب افتراش الحریر

۱۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب ماجاء فی القصد فی الوضوء

س: اسراف کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کے علاج کی کوئی جزوی تدبیر نہیں ہے کیونکہ مسرف آدمی لذت پرست ہوتا ہے اور اپنے مرض کو مرض سمجھنے پر تیار نہیں ہوتا ورنہ تو سادہ سی بات تھی کہ اسراف کا علاج یہ ہے کہ اسراف سے بچا جائے۔ اس سے جان چھڑانے کی اگر کوئی موثر صورت ہے تو وہ یہ کہ آدمی دین پر چلنے کا مصمم ارادہ کرے اور طبیعت کی اسراف پسندی کو قابو میں رکھنے کے لیے اس کا رخ انفاق اور فیاضی کی طرف موڑ دے، یعنی جتنا خود پر خرچ کرتا تھا وہ اردگرد کے مستحق لوگوں پر خرچ کر دے۔ اس کے علاوہ اسراف کا کوئی قابل اعتماد علاج نہیں ہے کیونکہ یہ ان خرابیوں میں سے ہے جو طبیعت کا داعیہ ہوتی ہے۔ داعیات کا ازالہ نہیں ہوتا ان کا مصرف اور سمت البتہ تبدیل ہو سکتی ہے۔

۞۞۞

خودرائی

حکم ربّانی

—﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا﴾

(الاحزاب۳۳:۳۶)

کسی مومن مرد یا عورت کے لیے گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملے کا فیصلہ کردیں تو پھر ان کے لئے اس میں کوئی اختیار باقی رہے اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی گمراہی میں پڑ جائے گا۔

—﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

(النساء۴/۶۵)

پس اے نبی! آپ کے رب کی قسم! ایسے لوگ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام باہمی جھگڑوں میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو فیصلہ آپ کریں اس پر وہ اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ دل و جان سے اسے تسلیم کرلیں۔

فرمان نبوی

—"عن ابن مسعودؓ: انه جاء یوم الجمعة والنبی یخطب فسمعه یقول "اجلسوا"۔فجلس بباب المسجد ای حیث سمع النبی یقول ذلک. فرآه النبی ﷺ فقال له: تعال یاعبداللّٰہ بن مسعود"(۱)

(۱) علاء الدین علی المتقی الھندی، کنز العمال، ج۱۱ص۱۸۳، دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۹ھ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جمعہ کے وقت میں مسجد نبوی میں داخل ہوا، رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرمارہے تھے۔ میں نے سنا آپ فرمارہے تھے ''بیٹھ جاؤ'' میں اس وقت مسجد کے دروازے پر تھا وہیں بیٹھ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے مجھے دیکھا تو فرمایا: عبداللہ آگے آجاؤ۔

—''عن ابی سعید الخدریؓ قال بینمارسول اللہ ﷺ یصلی باصحابه اذخلع نعلیه فوضعهماعن یساره، فلمارأی القوم ذلک القوانعالهم،فلما قضی صلاته قال:ماحملکم علی القائکم نعالکم؟ قالوارایناً القیت نعلیک إفقال:ان جبریل اخبرنی ان فیهاقذراً''(۱)

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ صحابہ کو نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ ﷺ نے جوتے اتار کر اپنے بائیں طرف رکھ دیے۔ سب صحابہ نے بھی جوتے اتار دیے۔ نماز ختم ہونے کے بعد آپؐ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم لوگوں نے جوتے کیوں اتار دیے؟ انہوں نے عرض کیا: آپؐ نے جوتے اتارے تو ہم نے بھی اتار دیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تو اس لیے اتارے تھے کہ مجھے جبریل نے آکر بتایا تھا کہ میرے جوتے کو گندگی لگی ہوئی ہے۔

---

(۱) رواہ القاضی عیاض فی کتابہ الشفاء

س: خودرائی سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: اس مرض کا سلسلہ تکبر، خود پسندی، عُجب اور خودنمائی وغیرہ سے ملتا ہے۔ اس کی عام طور پر دو شکلیں ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے اس کی تعریف میں کسی قدر تبدیلی آ جاتی ہے۔ خودرائی کی پہلی اور بڑی شکل یہ ہے کہ آدمی حق کو جاننے کے باوجود قبول نہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی صورتاً اور مزاجاً ایسا بن جائے کہ اس کے لیے اپنی رائے دوسروں کی رائے کے مقابلے میں قابل ترجیح اور قابل تسلیم بن جائے۔ پہلی صورت میں اس کی رائے اس حال میں حق پر غالب آ جاتی ہے کہ وہ یقین سے جانتا ہے کہ یہ حق ہے۔ دوسری شکل میں اسے سامنے والے کی دلیل کی صحت کا یقین ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے قبول نہیں کرتا۔ خودرائی کی پہلی شکل اختیار کر کے آدمی دین پر قائم نہیں رہ سکتا اور دوسری صورت میں پڑ کر دین کے واقعی حدود سے تجاوز کرنے سے نہیں رک سکتا۔ یعنی پہلی کا نتیجہ کفر ہے اور دوسری کا گمراہی۔

ویسے خودرائی کی ایک تیسری قسم بھی ہے جس کا تعلق آدمی کی نفسیاتی بناوٹ سے ہے۔ ایسا شخص کسی چیز کو اس کے حق یا ناحق ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی مرضی اور پسند ناپسند کی بنیاد پر قبول یا رد کرتا ہے اور اس سلسلے میں معاشرت میں اس چیز کی جو حیثیت مسلّم ہے، اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ خودرائی کی یہ قسم جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں عام ہے۔ غور سے دیکھیں تو خودرائی کی یہ قسم پہلی دو اقسام کا مجموعہ ہے اور اس کا ضرر ان دونوں کے مجموعی ضرر کے برابر ہے۔ اس طرح کی خودرائی میں مبتلا شخص اپنے آپ کو سنجیدگی اور کمٹمنٹ کی ادنیٰ ترین سطح سے بھی گرا دیتا ہے اور اس کا مجموعی رویہ انکار یا نافرمانی کی بجائے دین کو اپنے تابع کر لینے کا ہوتا ہے۔ یہ رویہ صاف انکار سے بھی زیادہ خطرناک مضمرات رکھتا ہے اور اس کی

وجہ سے دین اتنا سکڑ جاتا ہے کہ اس کے تشخص کی کوئی بھی صورت باقی نہیں رہتی۔ ہماری رائے میں مسلمان معاشرے میں خودرائی کی یہی قسم زیادہ تر پائی جاتی ہے اور ہمیں اسی کے ازالے کی کوشش زیادہ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ کرنی چاہیے۔

س: خودرائی کے کچھ مظاہر کی نشاندہی کر دی جائے تاکہ پہچاننے میں آسانی رہے؟

ج: ان مظاہر کی فہرست بنانے سے پہلے تمہیداً ایک بات کہنا ضروری ہے۔

مسلمانوں میں خودرائی کا سب سے بڑا مظہر سنت رسول اللہ ﷺ سے انحراف ہے۔ دین اپنی اعتقادی اور عملی تمام صورتوں میں اگر کسی ایک ماخذ سے اخذ کیا جا سکتا ہے تو وہ کوئی اور نہیں صرف سنت رسول اللہ ﷺ ہے، حتیٰ کہ قرآن بھی اپنی حجیت کا کامل اظہار سنت ہی کے ذریعے سے کرتا ہے۔ اس سے انحراف کی مندرجہ ذیل شکلیں ہمارے اندر پائی جاتی ہیں:

عملی انحراف یعنی داڑھی نہ رکھنا، باجماعت نماز کی پابندی نہ کرنا، جہاد کے تصور سے بدکنا، بے پردگی وغیرہ

اعتقادی انحراف: سنت کی جس تعریف پر امت صدیوں سے متفق چلی آ رہی ہے، اسے مجروح کرنا۔ اس کی مثالیں تو کئی ایک ہیں مگر نمونے کے طور پر ایک موٹی سی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بعض ایسے امور کی انجام دہی یا غیر موکد ترغیب ثابت ہے جس کا اتباع قانونی معنی میں واجب یا جس کا ترک قانونی معنی میں موجب ضرر نہیں ہے۔ ان امور کو ایک جدید قانونی ذہنیت کے ساتھ اس طرح categorize کرنا کہ دین سے انسان کی فطری قوتِ وابستگی کے وہ تقاضے بھی ملحوظ نہ رہ سکیں جو اس کے امور ثابتہ کی طرف تعظیم کے ساتھ لپکے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ مختصر یہ کہ دین کے عمومی حقوق کی نگہداری بھی

ایک خاص رویے کی متقاضی ہے جس کی تشکیل محض قانونی ذہن سے ممکن نہیں۔ دین اپنے ماننے والوں میں لامتناہی کمالات کے حصول کو بہرحال ممکن رکھتا ہے۔وہ رسول اللہ ﷺ سے تمام منسوبات کی شدید تکریم اور ان سے جذباتی وابستگی کے بغیر حاصل تو کیا ہوں گے، ان کا ابتدائی تصور بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔

اس تمہید کے بعد اب خودرائی کے چند بڑے مظاہر کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

ا۔ جدید علمی اور سائنسی تحقیقات کو قرآن وسنت پر حَکَم بنانا۔ یہ خودرائی کی ایک نہایت لطیف لیکن انتہائی عام قسم ہے۔ آدمی جس عہد میں رہتا ہے اس عہد میں مروجہ علمی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار کے ساتھ نفسیاتی طور پر کم وبیش ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا کہ اپنی ملکیت سے ہوتا ہے۔ ان کی مدد سے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے قامت میں اضافہ کرتا ہے، لہذا ایسا شخص دین کو اپنی رائے کے تابع کرنے کا جو راستہ سب سے پہلے کھولتا ہے وہ یہی ہے کہ متداول مسلّمات کو کسوٹی بنا کر قرآن وسنت کو اس پر پرکھتا ہے۔

دینی مسائل میں اپنی رائے قائم کرنا فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ہے تاہم اس طرح کے عمل میں ایک ضروری اہلیت بھی درکار ہوتی ہے۔ خودرائی والا آدمی اس کے فقدان کے باوجود نہ صرف یہ کہ ایک رائے قائم کر لیتا ہے بلکہ اس رائے پر ایسا وثوق بھی پیدا کر لیتا ہے جو ضروری علم و دانش کے بغیر خلاف فطرت اور غیر انسانی ہے۔

عامۃ الناس میں سے وہ لوگ جو فقہی تقلید کے خلاف تقریریں کرتے نظر آتے ہیں ان کی اکثریت ،گمان غالب کی رو سے، یا تو خودرائی میں مبتلا ہوتی ہے یا اس ابتلاء کے بالکل قریب ہوتی ہے، کیونکہ تقلید ایک مستقل دینی عذر ہے اور جو

آدمی یہ عذر رکھنے کے باوجود اس کے معمولی تقاضوں کی تکمیل کی طرف مائل نہیں ہوتا وہ خودرائی میں مبتلا بھی ہے اور غیر مخلص بھی ہے۔

۴۔ تقلید جامد: علم ہو یا نہ ہو، کسی شخص کا کسی خاص شخصیت یا رویے یا مکتب فکر کی تقلید کو ہر حال میں لازم قرار دے لینا تقلید جامد ہے۔ عموماً ایسا شخص جانتے بوجھتے قرآن و حدیث کی واضح مرادات کو بھی اپنے پسندیدہ امام یا مکتب فکر کے قیاسات کے تابع رکھتا ہے۔ اس رویے کو کئی نام دیئے جاسکتے ہیں جن میں سے سب سے چھوٹا نام خودرائی ہوگا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دو اشخاص خودرائی میں ضرور مبتلا ہوتے ہیں ایک وہ جو تقلید کا سرے سے منکر ہے اور دوسرا وہ جو تقلید کو دین کی روح سمجھتا ہو۔

۵۔ علم کے ہوتے ہوئے عمل نہ کرنا: یہ خودرائی کی ایک نفسیاتی قسم ہے۔ دینی معلومات اپنی ماہیت میں محرک عمل ہیں۔ عالم بے عمل گویا اس ماہیت کو منقلب کرنے کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن چونکہ یہ ارتکاب ایک خارجی اور اجتماعی دروبست نہیں رکھتا لہذا ہم نے اس رویے کو نفسیاتی خودرائی سے تعبیر کیا ہے۔ تاہم اس کا دینی ضرر بالکل واضح ہے۔

۶۔ مناظرے بازی کا شوق، خصوصاً فرقہ وارانہ مناظرے: اس طرح کے مناظروں کا محرک نصرت دینی نہیں بلکہ اپنے فرقے کی خودساختہ حقانیت کا اعلان ہوتا ہے۔ جو لوگ دینی مزاج رکھتے ہیں انہیں یہ بات فطری طور پر معلوم ہوتی ہے کہ صحت اور تغلیط کے واضح معیارات دستیاب نہ ہوں تو محض قیاس و استدلال کی بنیاد پر آپس میں جھگڑنے سے تمسک بالقرآن والسنہ کا داعیہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ دین میں ضرورت کے مواقع پر قیاس و استنباط وغیرہ کی ایک اہمیت ضرور ہے تاہم

کسی نص کی غیر موجودگی میں ان کے معارضے کی ایسی صورت جو ایک فریق کے دین کو مشکوک بنا دے، سخت ناپسندیدہ ہے۔ قیاس اپنے انتہائی دعوے کے مطابق بھی امکانی صحت ہی کا حامل ہوتا ہے لہٰذا اس کی بنیاد پر ایک دینی جنگ کی فضا پیدا کر دینا قرآن و سنت کے بنیادی تقاضوں کی ایک بدترین خلاف ورزی ہے۔ مذہبی گروہوں کے درمیان برپا ہونے والے اکثر مناظرے یا تو فقہی ہوتے ہیں، جن کا بیان ہم نے اوپر کیا، یا پھر ان کا تعلق ایمانی امور مثلاً توحید و رسالت وغیرہ سے ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کے مناظرے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں کیونکہ ان میں ہر مناظر قرآن و حدیث کو اپنے تابع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح کی خرابیوں سے امت کو محفوظ رکھے۔

۷۔ تہذیب، انسانی زندگی کی پیش رفت کا وہ اسلوب ہے جو تغیرات کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ بعض لوگ تہذیب اور تہذیبی اوضاع کو ایک سیکولر معنی دیتے ہیں اور اس پر کوئی دینی موقف اختیار کرنے کا جواز نہیں پاتے۔ یہ رویہ انسانی زندگی اور انسانی نفسیات کے تقریباً تمام مظاہر کو دین کی گرفت سے نکالنے کی ایک کوشش میں تبدیل ہو سکتا ہے، لہٰذا ایسے تمام تصورات قرآن و سنت کے مقابلے میں کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں تاہم ایک اصول اگر پیش نظر رہے تو آدمی اس طرح کی غلط فکری سے بچ سکتا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ انسان اور اس کے اندرونی و بیرونی ماحول کا ہر جزو لازماً کسی واضح دینی موقف پر استوار ہونا چاہیے ورنہ اس کی من حیث الکل بندگی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔

س: یہ ایک نازک بات معلوم ہوتی ہے لہٰذا اس کی کچھ مثالیں دے دی جائیں تو بہتر ہوگا؟

ج: رہن سہن، خورد و نوش اور پہننے اوڑھنے کے انداز سے کسی کا مذہبی ہونا یا نہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ ہر انسانی وضع اپنی ایک واضح اصل اور نسبت رکھتی ہے۔ مثلاً یہ ہو نہیں سکتا کہ انگریزی لباس دینی پژمردگی کا سبب نہ بنے۔ جدید رُجحان رکھنے والے علمائے مذہبیات نے چونکہ تہذیب کی روحانی ساخت کا مطالعہ نہیں کیا ہے لہذا ان کی اکثریت کے لیے یہ بات خاصی نامانوس ہوگی کہ اپنے دین سے باہر کے معاشروں سے ماخوذ اوضاع، غلط خیالات ہی کے برابر مضر ہیں۔ مثلاً جدید تہذیب کے لیے آمادگی کا ہر رویہ جس چیز کو سب سے پہلے متاثر کرتا ہے وہ ہے نفس کا سادہ تعلق بالدین۔ اب یہ بات تجربے سے (clinically) ثابت ہو چکی ہے کہ مسلمانوں میں دینی گہرائی کے خاتمے کا ایک بہت بڑا سبب انگریزی لباس ہے۔ تہذیبی اوضاع کس طرح انسان کو اندر سے متاثر کرتے ہیں؟ ان شاء اللہ اس موضوع پر ہم پوری تفصیل سے کسی اور جگہ کلام کریں گے۔ سردست اتنا ہی کافی ہے۔

س: خودرائی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: خودرائی کا تعلق بھی ان چند خرابیوں میں سے ہے جو انسان کی پوری شخصیت کو لپیٹ میں لے لیتی ہے لہذا اس کے نقصانات آدمی کے تمام رویوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان نقصانات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند بڑے نقصانات کی نشاندہی کریں گے:

۱۔ تکبر، جو ایک طرح سے خودرائی کا اصل سبب ہے۔ اور یہ خرابی پوری طرح جڑ پکڑ لے تو تکبر میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

۲۔ اس کے نتیجے میں آدمی حق کو قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

۳۔ بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت اور مسلمانوں کی خیر خواہی، اسلامی اخلاق و معاشرت کے بنیادی ارکان میں سے ہیں۔ خود رائے آدمی میں ان کا فقدان ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اسلامی ماحول میں کھپنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور رفتہ رفتہ کج خلقی، سنگ دلی، سخت کلامی وغیرہ کا نمونہ بن کر رہ جاتا ہے۔

۴۔ خود غرضی: خود رائی خود غرضی ہی کا ایک رویہ ہے۔

۵۔ خود رائی کا غالباً سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس میں مبتلا شخص شعور، طبیعت اور ارادے کی روح سے دین کو سمجھنے، دین پر چلنے اور دین سے سچا تعلق رکھنے کے لائق ہی نہیں رہتا، نتیجتاً مکمل بے دینی کا شکار ہو جاتا ہے۔

باقی نقصانات مثلاً قرآن وسنت کو اپنی رائے کے تابع کرنا، بدعت پسندی وغیرہ کی ضروری تفصیل اوپر آ چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: خود رائی کا علاج مشکل ہے، چونکہ خود رائے آدمی کو علاج بتانا ایسا ہی ہے جیسے کسی پاگل کو دواؤں کا نسخہ تھما دیا جائے۔ تکبر وغیرہ کی طرح اس کے مریض کا علاج بھی کسی دوسرے ہی کی نگرانی میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ شخص اپنے آپ کو مریض نہیں سمجھتا اس لیے اس کے معالجے میں بڑی حکمت اور نفسیاتی بصیرت درکار ہے۔ تاہم ذیل میں کچھ ایسی چیزیں تجویز کی جا رہی ہیں جنہیں اختیار کر کے خود رائی کے ازالے میں خاصی مدد مل سکتی ہے:

ا۔ ہر خود رائے آدمی کا ایک خاص میدان ہوتا ہے جس میں وہ اپنی رائے چلاتا ہے، اگر کسی طرح اسے یہ باور کرا دیا جائے کہ وہ ان معاملات کے مبادی کا بھی پورا علم نہیں رکھتا تو اس کی خود رائی کی طاقت بڑی حد تک ٹوٹ جائے گی

مثال کے طور پر ایک آدمی ضروری علم کے بغیر قرآن کی من مانی تفسیر کرتا ہو تو اسے کسی بھی حیلے سے اس طرف متوجہ کرنا چاہیے کہ تم تو عربی ہی نہیں جانتے، پھر اس کام میں کیسے پڑ گئے؟

۲۔ خودرائی کا ایک موثر علاج یہ بھی ہے کہ اس میں مبتلا آدمی سے خود اس کی مخالفت میں دلیل طلب کی جائے، یعنی وہ جب اپنی رائے کا اظہار کرے تو اسے اہمیت دینے کے انداز میں سننے کے بعد اس شخص کو اکسایا جائے کہ وہ خود اپنی رائے کو رد کر کے دکھائے۔ اکثر خودرائے لوگ جوش میں آ کر یہ کام بھی کر گزرتے ہیں۔ اس طریقے کو تواتر سے استعمال کیا جائے تو اس آدمی کو اپنی رائے پر اعتماد نہیں رہے گا اور نفسیاتی طور پر وہ پہلے سے طے شدہ امور میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس کے نتیجے میں ممکن ہے کہ اس کی ضروری خوداعتمادی بھی مجروح ہو جائے لیکن وہ ایک بڑے مرض سے نجات ضرور پا جائے گا۔

۳۔ خودرائے آدمی میں سب سے بری قباحت یہ ہوتی ہے کہ وہ حسن اتباع سے عاری ہوتا ہے۔ اگر بعض اعمال کو چیلنج بنا کر اس کے سامنے پیش کیا جائے تو اس کا دھیان فکر سے عمل کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، اور ظاہر ہے عمل کی اساس یعنی حکم اور عمل کی تمام صورتیں پہلے سے موجود ہوتی ہیں، ان میں مشغول ہو کر خودرائی کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔

۴۔ خودرائے آدمی کا مضحکہ اڑانا یا اس سے تحکمانہ انداز سے بات کرنا سخت مضر ہے۔ نہایت نرمی کے ساتھ کچھ ایسے مسائل اس کے سامنے رکھ دینے چاہئیں جو کم از کم اس کے لیے لاینحل ہوں اور خود سوال کرنے والا یا تو ان مسائل کو

حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو یا اس کی کوئی صورت نکال سکتا ہو۔ یہ طریقہ بہت محفوظ اور مجرب ہے، اسے ضرور اختیار کرنا چاہیے۔

س: اس معاملے میں افراط وتفریط کا بھی امکان ہے۔ خود رائی کی قباحت تو بہرحال واضح ہے، تاہم بعض لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن کی سرے سے کوئی رائے ہی نہیں ہوتی۔ وہ بس سب کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔ اس رویے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: یہ سوال ایک تجزیے کا متقاضی ہے اور اس تجزیے کو چند مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ اپنی رائے کو ہمیشہ غالب رکھنا بھی ایک نقص ہے اور اسے ہمیشہ مغلوب رکھنا بھی ایک کمی ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آدمی کے اندر جو رائے بنتی ہے اس کا اصول تشکیل وتکمیل کیا ہے؟ اور اس رائے کے صحیح یا غلط ہونے کا تعین جس معیار سے کیا جائے گا خود وہ معیار کیا ہے؟ یہ دو باتیں اگر کھل جائیں تو ان شاء اللہ گفتگو کے اگلے مراحل سہل اور ہموار ہو جائیں گے۔

جس دائرے میں رہ کر ہم کلام کر رہے ہیں وہاں رائے کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ رائے جو کسی چیز کو ماننے سے بنتی ہے اور دوسری وہ جو کسی کو جاننے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے، اس کی ذہنی صلاحیتوں سے قطع نظر، حق کو اس کی ضروری تفصیلات کے ساتھ ماننا بھی لازمی ہے اور جاننا بھی۔ اس تسلیم وادراک کے بارے میں صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ ذہن سے نہیں بلکہ قرآن وسنت سے ہوگا، جو اس معاملے میں واحد کسوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو شخص اس کسوٹی کا ناگزیر ہونا تسلیم نہیں کرتا اور حق کو محض اپنے

دلائل کی بنیاد پر ماننے اور جاننے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ خود رائے ہے۔ اس کی نظر میں خود قرآن وسنت مدار حق نہیں بلکہ حق کی طرف اشارہ کرنے والی چیزیں ہیں اور اس اشارے کی تکمیل اس کی عقل کرتی ہے۔ دوسری طرف وہ آدمی ہے جو کسی بھی معاملے میں کوئی مضبوط موقف نہیں رکھتا۔ بلاشبہ یہ شخص حق کو جاننے اور ماننے کا قرآنی تقاضا پورا نہیں کرتا اور حق سے وابستگی کی ابتدائی سطح سے بھی محروم ہے۔ مختصر یہ کہ خود رائی ہو یا فقدان رائے دونوں حق سے دوری کے مظاہر ہیں۔

۞۞۞

لہوولعب

حکم ربانی

—﴿ یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْالَاتُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَااَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِاللّٰہِ ، ومَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ (المنافقون ۶۳:۹)

اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں۔ اور جو غافل ہو گئے وہ گھاٹے میں رہیں گے۔

—﴿ وَاِذَارَاَوْاتِجَارَةً اَوْلَھْوَاانْفَضُّوْااِلَیْھَاوَتَرَکُوْکَ قَائِمًا، قُلْ مَا عِنْدَاللّٰہِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّھْوِوَمِنَ التِّجَارَةِ، وَاللّٰہُ خَیْرُالرَّازِقِیْنَ ﴾

(الجمعہ ۶۲:۱۱)

اور اے نبی! بعض لوگ جب کوئی تجارت یا کھیل تماشا دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو خطبہ پڑھتے کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ ان سے کہیں کہ جو اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔

فرمان نبوی

— "یَأْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ" ھِمَّتُھُمْ بُطُوْنُھُمْ وَشَرَفُھُمْ مَتَاعُھُمْ وَقِبْلَتُھُمْ نِسَاؤُھُمْ ، وَدِیْنُھُمْ دَرَاھِمُھُمْ وَدَنَانِیْرُھُمْ ، اُوْلٰئِکَ شَرُّ الْخَلْقِ لَاخَلَاقَ لَھُمْ عِنْدَاللّٰہِ "(۱)

ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کی ساری جدوجہد پیٹ کے لئے ہوگی۔ عزت کا معیار دولت ہوگی، عورتیں ان کا قبلہ اور روپیہ پیسہ ان کا دین ہوگا۔ یہ بدترین لوگ ہوں گے جن کا اللہ کے ہاں کوئی اجر نہ ہوگا۔

(۱) رواہ الدیلمی

—''إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا أَرْسَلَ إِلَيْهِ مَلَكًا قَبْلَ الْمَوْتِ فَهَيَّأَهُ وَأَرْشَدَهُ وَأَصْلَحَهُ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى خَيْرِ حَالٍ ،فَيَقُوْلُ النَّاسُ: رحم اللّٰهُ فُلَانًا مَاتَ عَلٰى خَيْرِ حَالٍ۔ وَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ شَرًّا أَرْسَلَ إِلَيْهِ شَيْطَانًا فَأَغْوَاهُ وَأَلْهَاهُ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى شَرِّ حَالٍ''(۲)

اگر اللہ تعالیٰ کسی شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں تو موت سے پہلے اس کے پاس فرشتہ بھجواتے ہیں، وہ اس سے رہنمائی لیتا اور اپنے معاملات درست کر لیتا ہے تو اس کی موت پر لوگ کہتے ہیں ''فلاں شخص کی موت خیر پر ہوئی، وہ بھلا آدمی تھا۔'' اور جب اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی بھلائی نہ لکھی ہو تو اس کے پاس شیطان جاتا ہے اور اسے ورغلاتا اور طول امل میں مبتلا کر دیتا ہے تو اس کی موت پر لوگ کہتے ہیں کہ فلاں تو بری حالت میں مرا۔

س: لہوولعب کی تعریف؟

ج: فضولیات میں مشغولیت لہوولعب ہے اور یہ سب آدمی تفریح کی غرض سے کرتا ہے، حالانکہ نہ اس کا کوئی دینی فائدہ ہے اور نہ دنیاوی بلکہ اس کے برعکس نقصان یقیناً ہے۔ یہ خیال رہے کہ کھیل کود، ہنسی مذاق وغیرہ مسلمان کی زندگی میں وہ رنگ بھرتے ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو پسند ہیں لیکن لہوولعب کا معاملہ دوسرا ہے اور اس میں جھوٹ سچ، جائز ناجائز ملا ہوا ہے اور اس میں مشغولیت کم از کم اس پہلو سے قطعاً ناروا ہے کہ یہ انسان کو دینی فرائض سے غافل کر دیتی ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے یہ شرعاً ناروا ہے حسب قولہ تعالیٰ ''واذا راؤ تجارة او لهوا انفضوا اليها وتركوك قائما ۔قل ما عند الله خير من اللهو ومن التجارة ۔

(۲) رواہ الدیلمی

و اللّٰہ خیر الرازقین۔(الجمعة :۶۲:۱۱)

یعنی اے نبی! بعض لوگ جب کوئی تجارت یا کھیل تماشے دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو خطبہ پڑھتے کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ ان سے کہیں کہ ''جو اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔''

س: لہو ولعب اور تفریح میں کیا فرق ہے؟

ج: تفریح آدمی کی طبیعت میں فرحت، ذہن میں نشاط اور جسم میں قوت پیدا کرتی ہے۔ یہ تینوں چیزیں مطلوب ہیں۔ دوسرے یہ کہ تفریح اس نفسیاتی خشکی کا بھی علاج ہے جو تکبر، خودغرضی اور مریضانہ ذہنیت کا سبب بنتی ہے۔ یہ تفریح، جس کے خصائص ابھی بیان ہوئے، صرف دو شرائط سے مشروط ہونی چاہیے۔ شریعت کے کسی امر کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس میں ایسا انہماک نہ ہو جو بعض بہتر مشغولیات سے غافل کر دے۔ ان دو چیزوں کا خیال رکھتے ہوئے یہ بات شرعاً مستحب ہے کہ مسلمان اپنے نفس اور اپنے بدن کے حقوق پورے کرے یعنی انہیں راحت وقوت فراہم کرے تاکہ زندگی کے تمام معاملات میں اس کا دینی کردار بھی تقویت پائے۔ صحت اور فرصت اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں جن سے محرومی بعض فضائل سے محرومی بن جاتی ہے۔ لہٰذا انہیں حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کی ہر کوشش پسندیدہ ہے۔ لہو ولعب کا یہ معاملہ ہے کہ عموماً اس کی صورت تو تفریح کی ہوتی ہے لیکن اس میں مذکورہ بالا دونوں شرائط کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ مثال کے طور پر لہو ولعب کی عادت کئی شرعی احکام کی خلاف ورزی پر منتج ہوتی ہے اور وقت کا ضیاع اس کا لازمہ ہے۔

س: تفریح اور لہو ولعب میں فرق کرنے کے لیے یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان کے الگ الگ مظاہر بیان کردئے جائیں؟

ج: تفریح کے مظاہر:

۱۔ ہر طرح کی جسمانی ورزش (جس میں آداب ستر ملحوظ رکھے جائیں)۔(۱)

۲۔ لمبی سیر

۳۔ تیراکی

۴۔ مناظر فطرت کا مشاہدہ، خواہ اس کے لیے سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

۵۔ عزیزوں دوستوں کے درمیان ایسا ہنسی مذاق جو کسی کی دلآزاری کا سبب نہ بنے اور اس میں غیبت، فحش گوئی، جھوٹ وغیرہ کی آمیزش بھی نہ ہو۔

۶۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ جو طبیعت پر خوشگوار اثر مرتب کرے۔ اس میں بھی وہی احتیاطیں ہیں جو ہنسی مذاق کے معاملے میں بتائی گئی ہیں۔ البتہ جھوٹ کی آمیزش کی شرط یہاں ساکت ہے کیونکہ اس طرح کا لٹریچر فرضی صورتحال پر مشتمل ہوتا ہے لہذا قاری اس کے مندرجات پر یقین کرنے کی نیت سے ان کا مطالعہ نہیں کرتا۔

تاہم یہ ذہن میں رہے بعض تفریحات جائز ہونے کے باوجود کسی مصلحت اور ثقاہت کے منافی ہوسکتی ہیں۔

لہو ولعب کے مظاہر

وہ تمام کھیل جو غافل اور بے عمل لوگوں کا شعار بن گئے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ تفریح اور لہو ولعب میں طبیعت کی فرحت مشترک ہے لیکن ذرائع اور نتائج مختلف ہیں۔ تفریح

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب اللهو بالحراب ونحوها

کے ذرائع جائز اور نتائج مطلوب ہیں، جبکہ لہو ولعب کی ایک خطرناک قسم وہ ہے جو دینی رنگ میں اپنا اظہار کرتی ہے مثلاً عید میلاد النبی، بزرگوں کے عرس منانا، قوالیاں، دھمال، اکثر مناظرے اور جاہل عالموں کے وعظ، بزرگوں کے جھوٹے تذکرے سننا سنانا، پراسرار باتوں میں دلچسپی وغیرہ۔ غرض اس طرح کے لہو ولعب کو پہچاننے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی سنت و بدعت کے فرق کا علم حاصل کرے۔ دینی زندگی میں بدعت ہی لہو ولعب کی ماں ہے۔

س: لہو ولعب کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: لہو ولعب کا سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ آدمی دینی مزاج سے محروم ہو جاتا ہے۔ باقی نقصانات کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ غفلت

۲۔ اسراف

۳۔ لوگوں کو ایذا پہنچانا

۴۔ وقت کا ضیاع

۵۔ جھوٹ، غیبت، بہتان، فحش گوئی، نفس پرستی وغیرہ کا میلان۔

۶۔ دین کے دو بنیادی فضائل یعنی خشیت الٰہی اور اتباع رسول ﷺ کا فقدان۔

۷۔ دنیا کی بربادی

۸۔ لہو ولعب کا اس سے بڑا نقصان کیا ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق اس سے آدمی کی آخرت برباد ہو سکتی ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہو سکتا ہے۔(۱)

۱۔ جامع الترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء من تکلم بالکلمۃ لیضحک الناس، باب من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ

ج: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کے علاج کا اصول کوئی مثبت اور مقصدی مصروفیت ہے۔ وہ اختیار کر لی جائے تو ان شاء اللہ اس سے نجات مل جائے گی مثلاً تعلیم و تعلم، کوئی فن سیکھنا سکھانا اور کوئی تفریحی سرگرمی وغیرہ۔

۞۞۞

تن آسانی وآرام طلبی

حکم ربانی

—﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

(العنکبوت۲۹:۶۹)

اور جو لوگ ہماری خاطر مشقتیں اٹھائیں گے انہیں ہم اپنا راستہ دکھائیں گے۔ یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

—﴿وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ ﴾(الحجر۱۵:۹۹)

اپنے رب کی عبادت کیا کریں یہاں تک کہ آپ کا آخری وقت آجائے۔

فرمان نبوی

— ”نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِیْهِمَا کَثِیْرٌ مِنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ“(۱)

— دو نعمتیں ہیں، اکثر لوگ (ان کے غلط استعمال کی وجہ سے) خسارے اور گھاٹے میں رہیں گے، صحت اور فراغت۔

”عن عائشة رضی اللّٰه عنها، أنَّ النَّبِيَّ ﷺ کَانَ یَقُوْمُ مِنَ اللَّیْلِ حَتّٰی تَتَفَطَّرَ قَدَمَاهُ، فَقُلْتُ لَهُ: لِمَ تَصْنَعُ هٰذَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَکَ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ؟ قَالَ: اَفَلَا اُحِبُّ اَنْ اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا؟“(۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کو (اتنا لمبا) قیام فرماتے کہ آپ کے پیر مبارک پھٹ جاتے، میں نے آپ سے عرض کیا، آپ ایسا کیوں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف فرما دیئے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ”کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

(۱) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ماجاء فی الرقاق وان لاعیش الاعیش الآخرہ

(۲) صحیح بخاری، کتاب التهجد، باب قیام النبی ﷺ

س: اس کی تعریف؟

ج: جہاں مشقت ضروری ہو وہاں بھی اپنی راحت ڈھونڈنا، آرام طلبی ہے۔ اس کا مبنی نفس میں موجود خودغرضی، پست ہمتی، نشاط پسندی اور منفی آزادی ہے۔ گویا آرام طلبی مختلف امراض نفس کی علامت ہے۔

س: اس کے اہم مظاہر کیا ہیں؟

ج: جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر عرض کیا کہ آرام طلبی بذات خود کوئی مرض نہیں ہے بلکہ ایک مظہر (Symptom) ہے جس سے متعدد امراض کی طرف اشارہ ہوتا ہے، اس لیے اس کے مظاہر بھی خاصے متنوع ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی نفسی خرابی پر دلالت کرتے ہیں مثلاً:

- کسل
- جبن
- خودغرضی
- دین کے نظام العمل سے مکمل مغایرت
- معاشرے سے لاتعلقی
- محبت کا فقدان
- اسراف...... وغیرہ

س: اس کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی وہ دینی جذبہ، طرز احساس اور مزاج نہیں پیدا کر سکتا جو مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے۔ بندگی سخت کوشی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آرام طلب آدمی اس لازمی شرط ہی کو پورا نہیں کرتا۔ اس لیے

غالباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ آرام طلبی دینداری کی ضد ہے یعنی مسلمان بہت سی غلطیاں کر سکتا ہے لیکن آرام طلب نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ خیال رہے کہ بعض مشقتیں عظیمت کے مطالبے سے پیدا ہوتی ہیں، ان مشقتوں سے جی چرانا آرام طلبی نہیں ہے۔ آرام طلب آدمی شریعت کی واجب کردہ محنت و مشقت سے منہ موڑتا ہے۔ باقی نقصانات اس کے مذکورہ بالا مظاہر سے واضح ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دینی احکام پر کماحقہ عمل ایک گونہ مجاہدے اور مشقت کا متقاضی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی یہ صفت بیان فرمائی کہ یہ وہ لوگ ہیں جو راتوں کو آرام دہ بستروں سے اٹھ کر عبادت کی مشقت اٹھاتے ہیں (السجدہ ۲۳:۱۶) اور اللہ کی راہ میں سیسہ پلائی دیوار کی طرح جم کر لڑتے ہیں (الصف ۶۱:۴) اور آنحضرت ﷺ قیام اللیل میں اتنی مشقت اٹھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو مداخلت کرنا پڑی کہ اس مشقت کو کم کرو (المزمل ۷۳:۱۰) اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ آرام طلبی اور عیش کوشی سے بچیں کہ یہ انہیں زیبا نہیں (۱) اور انہیں عیش کوشی کے مظاہر سے بچنے کا حکم دیا جیسے فرمایا کہ ریشمی لباس نہ پہنو (۲)، اپنے کام خود کرو، کسی سے نہ کہو (۳) اور رزق کفاف (جس سے بمشکل گزر بسر ہو سکے) پر مطمئن رہو (۴)۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کے علاج کی چند سادہ تدابیر ہیں جن پر ذمہ داری سے عمل کر لیا جائے تو

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۵ ص ۲۴۳، المکتب اسلامی، بیروت ۱۹۸۳ء

۲۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم لبس الحریر وغیر ذلک للرجال

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب کراھۃ المسألۃ للناس

۴۔ سنن ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی الکفاف

ان شاء اللہ تعالیٰ اس مرض کا مکمل خاتمہ ہوسکتا ہے:

۱۔ نماز باجماعت کی پابندی

۲۔ تہجد کی کوشش

۳۔ دو چار مہینوں میں کچھ نفلی روزے

۴۔ کثرتِ تلاوت

۵۔ سخت جگہ پر سونا

۶۔ باقاعدگی سے ورزش کرنا

۞۞۞

فریب دہی

حکم ربّانی

—﴿ والَّذِینَ یُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِینَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا ﴾ (الاحزاب ۳۳:۵۸)

اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا پہنچائیں بغیر اس کے کہ انہوں نے کچھ کیا ہو تو انہوں نے بہتان کا اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔

—﴿ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴾ (التکاثر ۱۰۲:۱،۲)

لوگو! تمہیں بہت زیادہ حرص نے غافل کر دیا ہے یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچتے ہو۔

فرمان نبوی

—"...مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنَّا....."(۱)

جس نے ہم سے دھوکا کیا وہ ہم میں سے نہیں۔

—"بئس العبد عبد تخیل واختال ونسی الکبیر المتعال....."(۲)

بدترین بندہ وہ ہے جو اللہ کی کبریائی کو بھول جائے اور تکبر کرے اور لوگوں کو دھوکہ دے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب من غشا فلیس منا

(۲) جامع الترمذی، کتاب صفة القیامه، باب حدیث اضاعة الناس الصلاة و حدیث ذمانم العباد

فریب دہی

س: اس کی تعریف؟

ج: دھوکے کی تعریف تو دھوکے کے نام میں موجود ہے البتہ اس کی کچھ اقسام ہیں جنہیں الگ الگ بیان کر دینا چاہیے؟

۱۔ جھوٹ: اس کا دھوکا ہونا ظاہر ہے۔

۲۔ نفاق: یہ دھوکے کی وہ قسم ہے جو آدمی اپنے آپ کو بھی دیتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ یعنی غلط بات کو صحیح جان کر خود کو فریب دیتا ہے اور صحیح بات پر یقین نہ رکھتے ہوئے زبان سے اس کا اظہار کر کے دوسروں کو۔ نیز نفاق کی ایک سطح وہ بھی ہے جو انسانی معاشرت میں کارفرما ہو۔ ہم کسی کے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں اگر اس کے برعکس رائے کا اظہار کریں گے تو یہ بھی نفاق کی ایک علامت ہے۔ اس طرح کے نفاق میں چونکہ بہت سے لوگ مبتلا ہیں لہذا اس کے کچھ عملی مظاہر بتائے جاتے ہیں تاکہ انہیں پہچاننے میں آسانی ہو اور ان سے بچنے کی تدبیر کی جا سکے:

(۱) کسی شخص کو دل سے برا جاننا مگر زبان سے اس کی مدح کرنا: اس کی ایک تفصیل ہے۔ کسی ظالم کے ظلم سے بچنے کے لیے تو یہ کیا جا سکتا ہے بلکہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے کہیں کہیں ایسا کرنا شرعاً ضروری بھی ہو جاتا ہے، یہ نفاق نہیں ہے۔ نفاق یہ ہے کہ طمع اور بزدلی وغیرہ کی وجہ سے کسی کو ناپسند کرنے کے باوجود اسے یہ باور کروانے کی کوشش کی جائے کہ میں تمہارے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہوں۔ اسی لیے مبالغہ آمیز مداحی اور خوشامد کو شریعت برا سمجھتی ہے۔ مذکورہ نفاق کا درجہ تو

ان دونوں سے بڑھا ہوا ہے۔ اسی طرح کسی شخص کے بارے میں اگر دل میں تکدر محسوس ہو تو اس سے حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنا نفاق نہیں ہے۔ خواہ یہ تکدر بالکل صحیح بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے پتہ چلتا ہے(۱)

(ب) خوشامد: یہ نفاق کی وہ قسم ہے جو ہماری معاشرت میں بہت عام ہے۔ خوشامد کرنے والا عموماً زبان اور دل میں ایک نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ خوشامد کے کچھ مظاہر اس طرح کے نفاق سے خالی ہو سکتے ہیں تاہم ان کی قباحت دوسری ہے مثلاً جھوٹ، لالچ وغیرہ

(ج) تواضع اور خوش اخلاقی میں مبالغہ بھی نفاق ہے جس سے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں اور اس میں مبتلا شخص بھی عموماً اپنے آپ کو متواضع اور خوش اخلاق سمجھتا رہتا ہے حالانکہ وہ اندر سے ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اس خرابی میں مبتلا شخص کی ایک آسان سی پہچان یہ ہے کہ اس میں دینی حمیت نہیں ہوتی، یہ دین کے استخفاف پر بھی اپنی مصنوعی خوش اخلاقی کے خول سے نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ نیز ایسا آدمی اکثر اپنے گھر میں اور زیر دستوں کے ساتھ تکبر اور بد خلقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

(د) ریا: اس کی مفصل تعریف تو بیان کی جا چکی ہے۔ یہ فریب کاری کی ماں ہے۔ یہاں ہمارے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہوگا کہ ایسا شخص ظاہر اور جلوت معمور رکھتا ہے جبکہ اس کا باطن اور خلوت ویران ہو چکی ہوتی ہے۔ اس انتہائی بڑی خرابی میں دینداروں کی ایک قابل لحاظ تعداد مبتلا ہے۔

۳۔ ناپ تول میں کمی

۴۔ کسی آدمی کو اپنے فائدے کے لیے خوش فہمی میں مبتلا کر کے نقصان پہنچانا یا یہ عمل

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لم یکن النبیؐ فاحشاً و لا متفاحشاً

محض تفریح طبع کے لیے کرنا۔

۵۔ بچوں کو بہلانے کے لیے جھوٹا وعدہ کرنا یا جھوٹا عذر گھڑنا وغیرہ حتی کہ جانوروں کو چکمہ دینا بھی اسی قبیل میں آتا ہے۔

۶۔ کام چوری بھی ایک دھوکا ہے کیونکہ آدمی اپنے آجر یا افسر کو اس سے بے خبر رکھتا ہے۔

۷۔ حکومتی محصولات سے بچنے کے لیے غلط اعداد و شمار دینا۔

س: فریب دہی کے نقصانات؟

ج: ا۔ایک دھوکا کئی گناہوں کا مجموعہ ہوتا ہے، مثلاً جھوٹ، نفاق، ریا، کسب حرام، ایذائے مسلم وغیرہ، لہٰذا اس ایک عمل سے کئی گناہوں کی سزا کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

۲۔ دھوکا دہی کی عادت کئی بڑی خرابیوں کا سبب بن سکتی ہے۔ان خرابیوں کو گناہ کے معنی میں لیا جائے تو ان کا بیان اوپر ہو چکا اور انہیں نقصان کے معنی میں لیا جائے تو اس کی ایک لمبی فہرست بنائی جا سکتی ہے مثلاً دنیا و آخرت کی رسوائی، لوگوں کی نظر میں بے اعتباری، بے غیرتی وغیرہ۔

۳۔ اس کا ایک نقصان ایسا ہے جس کا الگ سے ذکر کرنا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ ایسا آدمی بندگی کے کسی بھی عمل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ لاکھ نمازیں بھی پڑھ لے تو ان میں ایک نماز بھی شریعت کے کم از کم معیار پر پوری نہیں اترے گی اور یہ شاخسانہ ہے طبیعت کی اس کجی کا جو اس عادت سے لازماً پیدا ہوتی ہے۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا سادہ سا علاج تو یہی ہے کہ جنہیں دھوکا دیا ہے، ان سے معافی حاصل کی جائے خواہ وہ معافی دھوکے کا ازالہ کر کے ہو خواہ ان کے آگے رونے گڑگڑانے سے حاصل ہو۔ اس کے بعد اس بری عادت سے توبہ کر کے اس سے باز رہنے کا پختہ عزم کرلیا جائے۔ کچھ اور علاج بھی ہیں جو بظاہر براہِ راست نہیں ہیں تاہم ان کا موثر ہونا تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہے مثلاً:

— سبحان اللہ وبحمدہٖ، سبحان اللہ العظیم اور استغفار کی کثرت

— لوگوں سے کم میل جول رکھنا۔

— جو چیز معاشرے میں امتیازی حیثیت رکھتی ہو، صلاحیت اور قدرت ہونے کے باوجود اسے اختیار نہ کرنا۔

— کفایت شعاری اور قناعت

— زیارتِ قبور، ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ۔

۞۞۞

مایوسی اور ڈیپریشن

حکم ربّانی

— ﴿وَإِذَآ أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ﴾ (الروم۳۰:۳۶)

لوگوں کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں اور اگر ان کے اعمال کی وجہ سے انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

— ﴿لَا يَسْـَٔمُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ﴾ (حٰمٓ السجدة، ۴۱:۴۹)

انسان اپنے لیے بھلائی مانگتے نہیں تھکتا لیکن اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے۔

فرمان نبوی

— ''ضحک ربنا من قنوط عباده وقرب غيره''(۱)

اللہ تعالیٰ اس شخص (کی نادانی) پر ہنستے ہیں جو اس سے مایوس ہو کر غیر سے امیدیں وابستہ کرتا ہے۔

— ''دخلنا على النبی ﷺ وهو يعالج شيئاً فاعناه عليه، فقال: لاتيأسا من الرزق ماتهززت رؤسكما، فان الانسان تلده امه احمر ليس عليه قشر، ثم يرزقه الله عزوجلّ''(۲)

دو صحابی کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے۔ آپؐ اس وقت گھر کا کچھ کام کر رہے تھے، ہم نے آپؐ کا ہاتھ بٹایا۔ آپؐ نے فرمایا رزق کے معاملے میں کبھی اللہ سے مایوس نہ ہونا خواہ تمہاری حالت کتنی ہی کمزور ہو۔ تم دیکھتے نہیں کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو کتنا کمزور اور عاجز ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کے رزق کا انتظام کرتے ہیں۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب السنة، باب فيما انكرت الجهمية
(۲) سنن ابن ماجہ، کتاب الزهد، باب التوكل واليقين

س: مایوسی سے کیا مراد ہے؟

ج: کسی عمل کے مطلوبہ نتائج نہ نکلنے سے بعض لوگوں پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو ان سے وہ عمل بھی ترک کروا دیتی ہے۔ اس کیفیت کو مایوسی کہتے ہیں۔ مایوسی کی کئی قسمیں اور کئی اسباب ہیں تاہم ترک عمل اس کا بنیادی خاصہ ہے۔ مایوس آدمی ترک عمل کے ساتھ ساتھ بعض حالات میں اللہ سے شاکی بھی ہو جاتا ہے۔ یہ وہ صورت ہے جو دینی اعتبار سے انتہائی خطرناک ہے۔

س: مایوسی کے اسباب کیا ہیں؟

ج: مایوسی کے چند بڑے اسباب و محرکات یہ ہیں:

۱۔ ارادے کا پورا نہ ہو سکنا: مثلاً ایک آدمی نماز پڑھنے کی خواہش رکھتا ہے اور تھوڑی بہت کوشش بھی کرتا ہے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ یہ ناکامی اسے مایوسی کی طرف دھکیل دیتی ہے اور وہ یہ سوچ کر اپنی کوششیں چھوڑ دیتا ہے کہ میں کچھ بھی کرلوں نمازی نہیں بن سکتا۔

۲۔ کسی عمل کے مطلوبہ نتائج نہ برآمد ہونا: مثلاً نماز پڑھنا مگر خشوع و خضوع حاصل نہ ہونا، ذکر کرنا لیکن اطمینان قلب سے محروم رہنا، رزق حلال کا اہتمام رکھنا مگر افلاس سے نجات نہ پانا۔ قرآن پڑھنا مگر طبیعت پر اس کا اثر نہ ہونا، کوئی پسندیدہ دینی منصوبہ بنانا مگر اسے روبہ عمل لانے میں مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا، کسی چیز کے لیے دعائیں کرنا مگر وہ چیز حاصل نہ ہونا وغیرہ۔

۳۔ دنیاوی زندگی کا غلط تصور یعنی دنیاوی مسائل اور مشکلات کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہونا کہ دین پر چلنے کا دنیا میں کوئی فائدہ نہیں۔ یہ خیال رفتہ رفتہ آدمی میں مایوسی کا مستقل حال پیدا کر دیتا ہے۔

۴۔ انسانی کمزوریوں اور خرابیوں کا شدید تاثر: یعنی ایک شخص کو اتفاق سے زیادہ تر ایسے لوگ ملتے ہیں جو بددیانت، وعدہ خلاف، ظالم...... وغیرہ ہوتے ہیں۔ مسلسل پیش آنے والے اس تجربے سے بھی مایوسی کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے گرم جوشی کے ساتھ دین سے وابستہ نہیں رہنے دیتی۔

۵۔ غمگین طبیعت اور قنوطی ذہنیت: یہ نفسیاتی عوارض ہیں جن میں مبتلا ہو کر آدمی مستقبل کی ہر صورت اور اپنے پورے حال سے مایوس رہتا ہے۔

س: مایوسی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: اس کے چند بڑے نقصانات یہ ہیں:

ا۔ مایوسی کا کم سے کم نقصان بھی بندگی میں ضعف پیدا کرتا ہے اور انتہائی نقصان یہ ہے کہ آدمی کفر تک جا پہنچتا ہے۔ گویا مایوسی کی ہر سطح پر ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ اس سے اللہ کے ساتھ تعلق کمزور پڑ جاتا ہے۔

۲۔ اللہ کی رحمت، نعمت اور قدرت کا عدم استحضار: مایوسی کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ مایوسی کے سبب کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہ خیال اتنا غالب آجاتا ہے کہ اسے یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ اللہ اس پر قادر ہے یا اس کی مہربانی عام ہے یا اس کی نعمتوں کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ وہ حالت ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ اس حالت کی دو پہچانیں ہیں۔ اس میں مبتلا شخص دعا کرنے کے تصور ہی سے بیزاری محسوس کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے شکایت کا اعلان کرتا پھرتا ہے مثلاً (نعوذ باللہ) اللہ نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا،
''کیا امتحان کے لیے میں ہی رہ گیا تھا''؟ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ نے مجھے پیدا کیوں کیا''؟ ......وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ ناشکری یعنی اللہ کی بے شمار نعمتوں کا احساس نہ رہنا۔

۴۔ خودغرضی: ایسا آدمی ہمیشہ اپنے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہے اور دوسروں کے کام آنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

۵۔ سنگ دلی اور بے حسی: جو لوگ معاشرے وغیرہ کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں وہ طبعاً سنگ دلی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ مایوسی میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس خرابی میں بھی زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے اردگرد کی خرابیاں تو گنوا دیتے ہیں مگر انہیں دور کرنے میں خود جو کردار ادا کر سکتے ہیں نہیں کرتے۔

۶۔ خودکشی کا میلان: یہ نفسیاتی مایوسی کا لازمی اثر ہے۔

۷۔ منشیات کا استعمال: مایوس آدمی تسکین کے ایسے ذرائع ڈھونڈتا ہے جنہیں اخلاق اور معاشرہ قبول نہیں کرتا۔ اس لیے اس حالت میں مبتلا لوگوں کی اکثریت منشیات کی طرف چلی جاتی ہے۔

۸۔ انتقام پسندی: مایوسی کی اکثر قسمیں آدمی کے اندر انتقام اور تخریب کے جذبات پیدا کر دیتی ہیں۔

۹۔ انسانوں خصوصاً والدین اور بھائی بہنوں سے نفرت: مایوس آدمی کی ایک نفسیات یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ان چیزوں سے چڑنے لگتا ہے جو اس کے قریب ہوں اور اس کی دسترس میں ہوں۔ اس لیے ایسا شخص سب سے پہلے ان لوگوں کو نشانہ نفرت و تحقیر بناتا ہے جو اس کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوں اور اس سے محبت کرنا جن کی مجبوری ہو۔ ایسے لوگ ظاہر ہے کہ والدین، بھائی بہن، بیوی بچے یا قریبی دوست ہی ہو سکتے ہیں۔

۱۰۔ بے عملی

۱۱۔ ہر چیز کو منفی انداز میں دیکھنا۔

۱۲۔ پاگل پن: مایوسی اپنی جگہ ایک ایسا مرض ہے جو ذہنی خرابی سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے جیسے اس میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے یہ خرابی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ مکمل دیوانگی کی نوبت آجاتی ہے۔

س: مایوسی کے بعض اسباب حقیقی اور واقعی ہوتے ہیں کیا اس صورت میں بھی مایوسی گناہ ہے؟

ج: بلاشبہ مایوسی کا سبب زیادہ تر حقیقی ہوتا ہے لیکن اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں ہے۔ ہماری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ مایوسی کا محرک نارمل اور حقیقی نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہر آدمی جانتا ہے کہ بعض خرابیوں یا محرومیوں کا ازالہ ضروری ہونے کے باوجود ناممکن ہے لیکن یہ احساس چند لوگوں کو مایوسی کی طرف دھکیل دیتا ہے جب کہ باقی لوگ کام میں لگے رہتے ہیں یا تنگ آ کر متعلقہ کوشش کو چھوڑ کر کوئی اور ہدف تلاش کر لیتے ہیں یا اور کچھ نہیں تو ہاتھ پر ہاتھ دھر کے اللہ کی رحمت کے انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ تینوں ردعمل بالکل نارمل ہیں اور آدمی کو اس کی معیاری سطح پر قائم رکھتے ہیں جبکہ وہ شخص جو مایوس ہو گیا، مایوسی کا مضبوط سبب تو یقیناً رکھتا ہے لیکن اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں کہ اس سبب نے اسے امید کے بیشمار اسباب سے منقطع کیوں کر دیا۔ اس کا اصلی جواب یہ ہے کہ مایوسی کا غلبہ عام طور پر ایسے لوگوں پر ہوتا ہے جو انسانیت، انسانی ذمہ داری اور زندگی کا نہایت محدود بلکہ غلط تصور رکھتے ہیں۔ امید سے خالی ہو جانا کسی بھی دلیل اور سبب سے انسانی حال نہیں ہے، خاص طور پر مسلمان کے لیے تو یہ اس کا دینی فریضہ ہے کہ مسلسل ناکامیاں بھی اسے کم از کم ناامید نہ ہونے دیں، چاہے کامیابی کی لگن اور اس کے لیے درکار کوشش کمزور ہی کیوں نہ پڑ جائے۔

مختصر یہ کہ مایوسی سمجھ میں آنے والے اسباب کے باوجود ذہن اور طبیعت کے

ردعمل کی وہ قسم ہے جو آدمی کو اپنی فطرت پر استوار نہیں رہنے دیتی۔ یہاں فطرت سے مراد انسان کے وہ مجموعی حدود ہیں جن سے تجاوز کرنا انسانی فعل یا حال نہیں کہلائے گا۔ اپنی استعداد پر نظر کرکے کسی مطلوب کام کے نہ ہو سکنے کا یقین مایوسی نہیں ہے، البتہ یہی یقین جب اہمیت اختیار کر جائے اور معاملہ اپنی استعداد اور صلاحیت سے بڑھ کر اللہ کی قدرت و انصاف وغیرہ تک پہنچ جائے تو اس سے جو شکایت آمیز حالت پیدا ہوتی ہے وہ کسی بھی دلیل سے بندگی کی حالت نہیں کہلا سکتی۔ گویا مایوسی بندگی کے لازمی احوال اور شعور کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس کا تسلط اوّل تو آدمی کو ضروری عمل کے قابل ہی نہیں چھوڑتا اور اگر تھوڑے بہت عمل کی صورت پیدا بھی ہو جائے تو اس سے وہ ضروری تعلق باقی نہیں رہتا جو بندے اور اس کے اعمال کے درمیان ہونا لازمی ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو مایوسی صرف عمل ہی نہیں بلکہ اس کی نیت اور اس کے شعور کو بھی مسخ کر دیتی ہے۔ عمل کی نیت اور شعور ہمیں اس کی نتیجہ خیزی کا یقین دلاتا ہے۔ یہ یقین ہی نہ رہے تو عمل کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔

مایوسی کے انہی نقصانات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ (۱) اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم (۲) نے بار بار فرمایا ہے کہ انسان کو کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور اسے انسان کی تھڑدلی قرار دیا ہے کہ وہ ذرا تکلیف آئے تو اللہ کی ساری نعمتوں کو بھلا کر مایوس ہونے لگتا ہے۔ (۳) اور انسان کو بار بار یہ یقین دلانے کے بعد کہ اللہ ہر وقت انسان کی مدد کرنے پر قادر ہے (۴) اور وہ اپنی طرف لوٹنے والوں کو پسند بھی کرتا ہے (۵)

۱۔ یوسف ۱۲: ۸۷، والزمر ۳۹: ۵۳

۲۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانہا تغلب غضبہ، وسنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب التوکل والیقین

۳۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۸۳، فصلت ۴۱: ۴۹

۴۔ النمل ۲۷: ۶۲، النساء ۴: ۴۵ وغیرہ

۵۔ التوبہ ۹: ۱۰۴

یہ انذار بھی کیا ہے کہ اس کے باوجود جو مایوس ہو کر اللہ سے منہ موڑتے ہیں وہ گمراہ (۱) اور کافر ہیں (۲) اور دنیا میں ذلت و نامرادی کے علاوہ آخرت میں بھی ان کا ٹھکانا دوزخ ہو گا۔ (۳)

س: مایوسی کے بارے میں کافی سخت باتیں ہو گئیں۔ تجربے میں آیا ہے کہ مایوسی کی کئی قسمیں ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ پہلے ان قسموں کو بیان کر دیا جائے تا کہ تشخیص اور علاج میں آسانی رہے؟

ج: اصولی طور پر مایوسی کی دو ہی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک ترک عمل تک پہنچا دیتی ہے جبکہ دوسری میں عمل کی صورت بدل جاتی ہے۔ وہ مایوسی جو بے عملی کا سبب بنتی ہے مضر ہے جب کہ دوسری قسم بعض شرائط کے ساتھ تو مضر ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ شرائط نہ پائی جائیں تو اس کا کوئی دینی ضرر نہیں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک ضروری دینی عمل سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہونے کی صورت میں ایک آدمی خود اس عمل کی افادیت اور اہمیت کا منکر ہو جاتا ہے اور اسے چھوڑ بیٹھتا ہے جبکہ دوسرا آدمی اسی صورت حال میں اس عمل کی کسی دوسری افادیت کو اپنا ہدف بنا لیتا ہے اور اس عمل پر قائم رہتا ہے۔ وہ شرائط جن کی موجودگی اس دوسرے آدمی کے لئے مضر ہے، ان میں بنیادی طور پر ایک چیز پائی جاتی ہے اور وہ ہے اس عمل کے درجے کو نہ ماننا، یعنی ایک آدمی نماز کے مطلوبہ اثرات سے محروم ہو کر نماز تو پڑھتا رہتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ تصور بھی رکھتا ہے کہ نماز تو بس ایک عادت ہے ورنہ اس میں کچھ رکھا نہیں۔ یہ وہ خرابی ہے جو ایمان کے خاتمے تک لے جا سکتی ہے اور اس

۱۔ الحجر ۱۵:۵۶

۲۔ یوسف ۱۲:۸۷

۳۔ العنکبوت ۲۹:۲۳

کے سامنے مایوسی کی پہلی قسم قدرے کم خطرناک ہے۔شکایت بہرحال نفاق یا انکار سے کم مضر ہوتی ہے۔

اب ہم دونوں صورتوں کی ٹھوس مثالیں پیش کرتے ہیں۔فرض کریں ایک شخص کی نماز طویل کوشش کے باوجود اچھی نہیں ہو رہی اور نماز کے جو نتائج زندگی میں نکلنے چاہئیں وہ نہیں نکل رہے تو اس صورت میں اس شخص کے اندر کئی طرح کے ردعمل پیدا ہو سکتے ہیں مثلاً

۱۔ وہ یہ کہہ کر نماز چھوڑ سکتا ہے کہ نماز میرے بس کی بات نہیں۔

۲۔ وہ نماز تو نہیں چھوڑتا لیکن یہ سمجھنے لگتا ہے کہ نماز کی خوبی اور تاثیر کے بارے میں مبالغہ کیا گیا ہے۔یہ چیزیں عملاً قابل حصول نہیں ہیں۔

۳۔ یہ آدمی نماز بھی چھوڑ دیتا ہے اور نماز کے حکم کا بھی انکار کر دیتا ہے۔

یہ مایوسی کے وہ نمونے ہیں جو شرعاً خطرناک ہیں اور آدمی کو کسی ہولناک انجام تک لے جا سکتے ہیں۔البتہ ایک مثال اور بھی ہے جو کم مضر ہونے کی وجہ سے ہم نے اوپر نقل نہیں کی، وہ یہ کہ ایسا آدمی یہ تصور کر کے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نماز سے خوش نہیں ہے، نماز کو چھوڑ کر کسی اور نیک کام مثلاً خدمت خلق وغیرہ میں لگ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو جائے گا۔اس فیصلے کی غلطی واضح ہے تاہم ایک بات یقینی ہے کہ یہ آدمی اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔اجمالاً کہا جائے تو شرعی نقطۂ نظر سے مایوسی ایک بڑا نقص ہے جو شدید کفر و نفاق میں بدل سکتا ہے ورنہ اپنی معمولی حالت میں بھی یہ بندگی کی کسی نہ کسی مضبوط بنیاد کو کمزور ضرور کر دیتا ہے۔

س: مایوسی کا علاج کیا ہے؟

ج: مندرجہ ذیل امور مایوسی کو ختم یا کم کر سکتے ہیں:

۱۔ صرف عمل کے ہو جانے کو کافی سمجھنا اور اس کی کوالٹی کو وقتی طور پر فراموش کر دینا۔

کو الٹی ظاہر میں بھی ہو سکتی ہے یعنی حسن ادائی کی صورت میں اور باطن میں بھی ہو سکتی ہے یعنی کیفیت۔

۲۔ اس یقین کو ایک مانوس پیرائے میں پختہ کرنے کی کوشش کہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے تعلق اس وقت بے معنی ہو جاتا ہے جب بندہ اپنی شرائط پر اصرار کرنے لگے۔

۳۔ اس یقین کا بار بار اعادہ کہ میری بہتری کی حتمی صورت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور وہ میرے لیے جو کچھ کرتا ہے اچھا کرتا ہے خواہ یہ اچھائی اس زندگی میں تکلیف دہ صورت میں کیوں نہ ظاہر ہو۔

۴۔ دنیا محض دار العمل ہے۔ نتائج آخرت میں سامنے آئیں گے۔ عمل اپنی روح میں مشقت، امتحان، اطاعت اور تسلیم کا نام ہے۔ اس سے عافیت، راحت، تسکین وغیرہ کا مطالبہ نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ تمام چیزیں نتائج کے اوصاف ہیں جو عمل سے فارغ ہو کر میسر آئیں گے۔

۵۔ قرآن سے ایسا تعلق پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کہ اس کا ذوق اس کے فہم پر غالب آ جائے اور اللہ کا کلام نہ صرف یہ کہ عمدہ اور محفوظ طریقے سے سمجھ میں آنے لگے بلکہ دل پر اثر بھی کرے۔ اس کے بغیر وہ دینی احوال نہیں پیدا ہو سکتے جن سے محروم ہو کر مسلمان ہونے کا کوئی حقیقی مطلب نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد رہنی چاہیے کہ دین سے دور لے جانے والے احوال پر اگر کوئی چیز حاوی آ سکتی ہے تو وہ تعلق بالقرآن اور حبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ بلکہ یہ بندگی کی تمام قوتوں کا سرچشمہ ہے اور اس سے مناسبت پیدا کر کے انسانی طبیعت اپنے اندر واقع ہونے والی ہر خرابی پر غالب آ سکتی ہے۔

۷۔ ایسے لوگوں کی سرگزشت کا مطالعہ جو پے در پے ناکامیاں اور مصائب جھیل کر بالکل نیچے سے اوپر آئے اور انسانی تاریخ کو ایک فیصلہ کن موڑ دینے والے کی حیثیت سے اپنا نام منوا گئے مثلاً حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، سیدنا بلال حبشیؓ، تیمور لنگ، ظہیر الدین بابر، سٹیفن ہاکنگز وغیرہ۔

۸۔ تفریح خصوصاً ایسے کھیل کود جو جسم کو تھکاتے ہیں۔ ان کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی مشقت اور اس کے اچھے نتیجے کے تصور سے عملاً مانوس ہو جاتا ہے۔

۹۔ خدمت خلق یعنی لوگوں کے مسائل حل کرنا۔ اس کے نتیجے میں اس خود مرکزیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو مایوسی وغیرہ کی ماں ہے۔ لوگوں کے مسائل حل کرنے کی تگ و دو کرنے والا اپنی طرف متوجہ ہونے کا وقت ہی نہیں نکال سکتا۔ مایوس آدمی کو یہ چیز شدت سے درکار ہوتی ہے۔

۱۰۔ اگر کوئی نفسیاتی عدم توازن ہو تو ماہر نفسیات کے پاس ضرور جانا چاہیے۔

لوگوں کے حقوق غصب کرنا

حکم ربانی

—﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا ﴾(النساء۴:۵۸)

اے مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو۔

—﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾(الانفال۸:۲۷)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ بے ایمانی نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو جبکہ تم جانتے ہو کہ یہ برا فعل ہے۔

فرمان نبوی

—"قال اللّٰہ تعالٰی: ثلاثة انا خصمهم یوم القیامة، رجل اعطی بی ثم غدر، ورجل باع حُرّاً فاکل ثمنه ورجل استأجر اجیراً فاستوفی منه ولم یعطه اجره"(۱)

اللہ تعالٰی فرماتے ہیں کہ تین آدمی ایسے ہیں جن کے خلاف قیامت کے دن میں حق طلبی کا دعویٰ کروں گا۔ ایک وہ شخص جو میرا نام لے کر عہد باندھے پھر اسے توڑ دے، اور وہ جو آزاد شخص کو بیچے اور اس کی قیمت ہڑپ کر جائے اور وہ جو کسی کو ملازم رکھے، اس سے پورا کام لے اور پھر اسے اجرت نہ دے۔

—"ملعون من ضار مومناً أو مکر به"(۲)

وہ لعنتی ہے جو مسلمان کو نقصان پہنچائے اور اس کے ساتھ مکر کرے۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حُرّاً

(۲) جامع الترمذی، ابواب البرّ والصله، باب ماجاء فی الخیانة والغش

س: تعریف؟

ج: اس کی تعریف تو واضح ہے البتہ اتنی وضاحت ضروری ہے کہ حقوق کی چند قسمیں ہوتی ہیں۔ مسلم معاشرت میں ان تمام حقوق کی پاسداری یکساں طور پر لازمی ہے اور ان میں سے ہر ایک کی خلاف ورزی شرعاً بڑا گناہ ہے۔ ایک انسان کے دوسرے پر جو حقوق ہوتے ہیں ان میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔ اس کے مال میں ناجائز تصرف نہ کیا جائے۔ چوری، فریب، خیانت، جان بوجھ کر غلط مشورہ دینا وغیرہ ناجائز تصرف کی ذیل میں آتے ہیں۔

۲۔ اس کی آبرو کو مجروح نہ کیا جائے۔

۳۔ اس کو جانی یا بدنی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

۴۔ اس کو ایسی اذیت نہ دی جائے جس کا وہ مستحق نہ ہو۔

۵۔ اس سے جھوٹ نہ بولا جائے، وعدہ خلافی نہ کی جائے اور مشورہ دینے کی اہلیت نہ ہونے پر مشورہ نہ دیا جائے۔ تعلیم وغیرہ کے معاملے میں بھی یہی اصول ہے۔ نااہل معلم یا مربی اپنے شاگردوں کا ایک بڑا حق غصب کرتا ہے۔

۶۔ اس کی خوشامد اور جھوٹی تعریف نہ کی جائے یعنی اس کے بگڑنے کا کوئی سامان نہ کیا جائے۔

۷۔ اس سے تعلق اور گفتگو میں دین کو مقدم رکھا جائے۔

ان میں سے کسی ایک کی خلاف ورزی بھی یا تو گناہ ہے یا ایسی کوتاہی ہے جس کا آخر میں حساب دینا ہوگا۔ ان کے علاوہ حقوق کی ایک ذاتی قسم بھی ہے۔ آدمی پر لازم ہے

کہ وہ اپنی ہدایت کا سامان کرے اور اپنے نفس پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ بلا ضرورت نہ ڈالے۔ اس ضابطے کو فراموش کرنا گناہ بھی ہے اور نفسیاتی کجی بھی۔ اسی طرح شریعت نے اہل حقوق کے مختلف طبقات بھی مقرر کر دیئے ہیں مثلاً والدین، اولاد، رشتہ دار، پڑوسی، دوست احباب، شوہر اور بیوی، عام مسلمان، غیر مسلم وغیرہ۔ ان کے حقوق بھی متعین ہیں اور ہر مسلمان انہیں ادا کرنے کا پابند بھی ہے۔

حقوق کی پوری تفصیل کو ہم اپنی سہولت کے لیے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ ان کی ادائی کی طاقت اور جذبہ ایک ہی مرکز سے پھوٹتا ہے لہٰذا یہ بات کسی بھی درجے میں قابل قبول نہیں ہے کہ آدمی اللہ کے حقوق ادا کرے اور بندوں کی طرف سے غافل ہو جائے یا بندوں کا خیال رکھے اور اللہ کی پرواہ نہ کرے۔ یہ اصول جاننا بہت ضروری ہے کہ حقوق و فرائض کا پورا نظام اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے۔ اس بنیاد کو بھول کر یہ سارا قصہ محض بے معنی ہے اور شرعاً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مختصر یہ کہ اصل چیز اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری ہے۔ یہ ہر نیکی اور خیر کی بنیاد ہے جس سے کٹ کر کوئی چیز خواہ کتنی بھی بھلی معلوم ہو، بیکار ہے۔

س: اس تمہید میں بہت سی باتیں آپس میں الجھ گئی ہیں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم حقوق اللہ سے بات شروع کریں اور پھر ہر جزو کی علیحدہ علیحدہ تفصیل بیان کریں؟

ج: تمہید ہمیشہ بحث کے خلاصے کو بیان کرتی ہے۔ اس لیے وہاں ساری باتیں یکجا ہو گئی ہیں اب ہم آپ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق آگے بڑھیں گے۔ سب سے پہلے حقوق اللہ کی طرف آتے ہیں۔ ان کی ضروری تفصیل درج ذیل ہے:

اللہ کا بندوں پر سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور اس کے احکام کی پوری اطاعت کی جائے۔ مختصر یہ کہ

بندے کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اللہ پر خود اسی کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق ایمان رکھا جائے اور اس ایمان کے تمام تقاضے، خواہ وہ علمی ہوں یا عملی، پورے کیے جائیں۔ باقی اللہ کے حقوق کی فرداً فرداً تفصیل سب کو معلوم ہے، الگ سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

س: غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق بھی یہاں مجملاً بیان کیے جا سکتے ہیں؟

ج: جی ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کے معاملے میں بھی اصول یہی ہے کہ آپؐ پر شریعت کی بتائی تفصیل کے مطابق ایمان رکھا جائے اور محبت و اطاعت یا تعلق کی کسی بھی سطح پر آپؐ کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ کسی کو آپؐ کے برابر بھی نہ لایا جائے۔ عملی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو امت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ آپؐ کے لائے ہوئے دین کو اس کی صحیح صورت میں محفوظ رکھا جائے اور اس پر پوری طرح عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

س: یہاں ایک خیال پیدا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کا بیان حقوق العباد کے ساتھ کرنا مناسب تھا یعنی حقوق العباد کا آغاز اس سے کیا جاتا؟

ج: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق اصولی طور پر حقوق العباد ہی ہیں لیکن آپؐ کے امتیاز کو اشتراک پر فوقیت دینا ضروری ہے۔ اسی لیے ہم نے آپؐ کے حقوق کو حقوق العباد کی ذیل میں بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی یہ سامنے کی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کی تعمیل پر دین کا دارومدار ہے۔ یہ حیثیت حقوق العباد کی کسی بھی قسم کو حاصل نہیں۔

س: یہ بات تو سمجھ میں آ گئی اب حقوق العباد کی بھی کچھ تفصیل بیان کر دیں؟

ج: اپنے نفس کے حقوق:

۱۔ اس میں سے امارگی زائل کرنے کی کوشش کی جائے یعنی دین پر چلتے ہوئے اس کا تزکیہ کیا جائے۔

۲۔ نفس کے دو حصے ہیں ایک طبیعت اور دوسرے ذہن۔ طبیعت کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچے تعلق کے احوال فراہم کرنے کی کوشش کی جائے اور ذہن کو دین کا صحیح فہم مہیا کیا جائے۔

۳۔ نفس کا وہ حصہ جو طبیعت کہلاتا ہے، اسے دین کے حالی فضائل سے اس طرح مانوس کیا جائے کہ ہر فضیلت سے مناسبت رکھنے والا ایک ماحول اس کو دے دیا جائے مثلاً نفس میں تعلق باللہ کا سب سے سریع التاثیر حال شکر کا ہے۔ جائز ذرائع سے اس کی راحت کا سامان کر کے اس میں یہ کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح مثال کے طور پر صبر کو لے لیں تو یہ چیز بھی اسے شکر کے زور پر سکھائی جا سکتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جہاں اتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہاں اگر میری ایک آدھ خواہش پوری نہیں ہوتی تو کیا ہوا؟

اسی طرح نفس کا وہ حصہ جو ذہن ہے، اس کے دینی Content کو بالکل واضح، فیصلہ کن اور صحیح صورت میں رکھا جا سکتا ہے۔ بس اصول یہ ہے کہ طبیعت کو ھوی اور ذہن کو رائے کے تابع نہ ہونے دیا جائے۔

۴۔ اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے، خواہ وہ بوجھ اٹھانا موجب فضیلت ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اگر نفس تنگی میں پڑ گیا تو ایک بڑا عمل تو ممکن ہے وہ کر گزرے لیکن پھر یہ روزمرہ کے معمولی اعمال خیر کے بھی قابل نہیں رہتا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نفس کی خوئے انکار اور سرکشی کو ابھرنے کا بہانہ نہیں دینا چاہیے۔ خواہ اس کے لیے رخصت ہی پر عمل کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ لوگ بڑی بڑی

دینی ذمہ داریاں خود پر لا د لیتے ہیں لیکن ابھی تھوڑی ہی مدت گزرتی ہے کہ فرائض ادا کرنے کے لائق بھی نہیں رہتے۔

۵۔ نفس بمعنی ذات کے بھی کئی حقوق ہیں جن سے غفلت برتنا شرعاً ناروا ہے مثلاً خود کو ہلاکت میں نہ ڈالنا، اپنے مال و جان وعزت کی حفاظت کرنا، اپنی صحت کا خیال رکھنا، خود کو صاف ستھرا رکھنا وغیرہ۔

باقی رہے وہ اہل حقوق جن کی فہرست اوپر بنائی گئی ہے تو ان کے حقوق معروف ہیں اور ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ دو چیزیں ادائے حقوق کی روح ہیں، خوفِ خدا اور ایثار۔ ان کی نگہداشت اور نشوونما کی کوشش کرنے والا، لوگوں کے حقوق اچھی طرح پورے کر سکتا ہے۔

س: حقوق تلفی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: اس خرابی کے متعدد نقصانات گنوائے جا سکتے ہیں لیکن ان میں سے دو بنیادی ہیں:
ایک: آدمی کے دل سے اللہ تعالیٰ کا خوف نکل جاتا ہے۔ دوسرے: انسانیت کے بنیادی اوصاف باقی نہیں رہتے یا کمزور پڑ جاتے ہیں۔

جو شخص دوسروں کی حق تلفی کو اپنی عادت بنالیتا ہے وہ دین سے مجموعی وابستگی کا کوئی ایک تقاضا بھی پورا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کی عبادات دکھاوا ہیں اور اس کے تمام اعمال بے روح، کیونکہ یہ ایک ایسی لعنت ہے جو آدمی کے پورے وجود کو لپیٹ میں لے لیتی ہے، یہ نہیں ہوتا کہ ایک حصہ خراب ہو گیا تو باقی بھی محفوظ ہے۔ گویا اس خرابی کی زد آدمی کے تمام دینی و انسانی اوصاف پر پڑتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد نقصانات کی فہرست گنوانا غیر ضروری ہے، یہی کافی ہے۔

س: اس بری عادت کا علاج کیا ہے؟

ج: اس کا بس ایک علاج ہے، بہت سادہ اور واضح، جو حقوق تلف ہوئے ہیں، ان کی تلافی کریں اور اس معاملے کو اس طرح نمٹائیں جس طرح کوئی دیانت دار شخص اپنے قرضے چکاتا ہے۔ یعنی یا تو متاثرہ لوگوں سے اپنی کوتاہی اور زیادتی معاف کروائی جائے یا پھر اس کے کفارے کی کوئی متفقہ صورت اختیار کی جائے۔ اس کے علاوہ اس کا نہ کوئی نفسیاتی علاج ہے نہ عملی۔ یہ ضرور ہے کہ اس عزم تک پہنچنے کے لیے کچھ محرکات درکار ہیں، ان میں سب سے بڑا محرک اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ اسے پیدا کرنے کی مختلف تدابیر کی جاسکتی ہیں: مثلاً آخرت میں اللہ تعالیٰ کے جلال کا تصور، دوزخ کا خیال، عذابِ قبر کا تصور اور یہ کہ اس خرابی کی وجہ سے میں رسول اللہ ﷺ کی نفرت کا نشانہ بنوں گا۔ یہ آخری خیال طبیعت کے لیے بہت موثر ہے۔

س: کیا ادائی حقوق میں کوتاہی اور غصب حقوق میں فرق ہے؟

ج: دوسروں کے حقوق کی ادائی میں کوتاہی اور ان کے حقوق غصب کرنا ایک لحاظ سے مختلف چیزیں ہیں۔ چوری، ڈاکے، خیانت وغیرہ کا تعلق غصب حقوق سے ہے اور یہ حق تلفی یعنی دوسرے کے حقوق نہ ادا کرنے سے بڑا گناہ ہے۔ جیسے کسی کی رقم ضائع کر دینا بھی گناہ ہے لیکن وہ رقم چھین لینا بلاشبہ اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔

❁❁❁

کسب حرام

حکم ربّانی

— ﴿وَلَاتَاكُلُوْااَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْابِهَااِلَى الْحُكَّامِ لِتَاكُلُوْا فَرِيْقًامِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾(البقرہ ۲:۱۸۸)

اور یادرکھو! ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ، رشوت کو حاکموں تک رسائی کا ذریعہ نہ بناؤ اور جان بوجھ کر دوسروں کا مال ہڑپ نہ کرو۔

— ﴿يَـااَيُّهَـاالَّـذِيْنَ اٰمَنُوْالَاتَاكُلُوْااَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّااَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ......﴾(النساء۴:۲۹)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ۔البتہ باہمی رضامندی سے تجارت کے ذریعے جو مال حاصل کرو وہ کھا سکتے ہو۔

فرمان نبوی

— ’’كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه‘‘(۱)

ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت حرام ہے۔

— ’’اشدالنـاس حسـرة يوم القيامة رجل كسب مالاً من غيرحلّه فدخل به النار‘‘(۲)

قیامت کے دن سب سے حسرت ناک انجام اس شخص کا ہوگا جس نے دنیا میں حرام مال کمایا ہوگا اور وہ اسے جہنم میں لے جائے گا۔

---

(۱) جامع الترمذی، ابواب البرّ، باب ماجاء فی شفقة المسلم علی المسلم

(۲) مسند احمد بن حنبل، ۳:۰۷۰،۴۷

س: تعریف؟

ج: کسب حرام کی تعریف تو واضح ہے، اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس کے مختلف النوع نقصانات اور اس کے علاج کی تدابیر تک محدود رہیں گے۔

س: یہ تو ٹھیک ہے کہ حلال و حرام پوری طرح واضح ہیں تاہم موجودہ صورتحال بر لحاظ سے اتنی پیچیدہ ہو چکی ہے کہ طرح طرح کے حیلوں سے ناجائز کو جائز بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ کسب حرام کی ان صورتوں کو واضح کر دیا جائے جن کے بارے میں مجموعی طور پر عوام حتی کہ بعض اہل علم بھی غلط فہمی کا شکار ہیں؟

ج: اس سوال کے جواب میں بعض انتہائی تکنیکی مباحث اٹھ سکتے ہیں۔ ہم اس طرف نہیں جانا چاہتے، البتہ ہمارے یقین کی حد تک موجودہ نظام معیشت میں بعض چیزیں حرام اور ناجائز ہیں جنہیں حکومتی سرپرستی اور بعض اکا دکا علما کی تائید سے امت میں یا تو جاری کر دیا گیا ہے یا جاری کرنے کی کاوش کی جا رہی ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ تمام بنک اکاؤنٹس کا منافع

۲۔ تمام انعامی سکیمیں جن کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جاتا ہے۔

۳۔ حرام اور ممنوع چیزوں کی تجارت مثلاً ایسی وڈیو آڈیو شاپس جن میں فلموں اور گانوں کے کیسٹ بیچے جاتے ہیں۔

۴۔ انشورنس سکیموں کے فوائد

۵۔ اسٹاک مارکیٹ کا کاروبار

۶۔ اکثر کمپنیوں کے شیئرز پر ملنے والا منافع

۷۔ لہوولعب کو ترویج دینے والے سامان کی تجارت

۸۔ تراویح پڑھانے کی اجرت

۹۔ عورتوں کی وہ تمام ملازمتیں جن میں بلاضرورت بے پردگی لازمی ہوجائے۔

۱۰۔ عورتوں کی تصویروالی چیزوں کی خریدوفروخت

۱۱۔ بازاروں میں ڈالی جانے والی کمیٹیاں

۱۲۔ فحش اور لادینی کتابوں اور رسالوں کا کاروبار

۱۳۔ داڑھی مونڈنے کی اجرت

۱۴۔ فلموں کا کاروبار

۱۵۔ منشیات کی خریدوفروخت

۱۶۔ عورتوں کے لیے باریک کپڑے تیار کرنے اور انہیں غیر ساتر ڈیزائن میں سینا۔

۱۷۔ کثرت رزق کے لیے کافر ممالک کے غیر اسلامی ماحول میں جاکر ملازمت کرنا۔

۱۸۔ بنک سے سود پر روپیہ لے کر کاروبار کرنا

۱۹۔ ملازم کا اپنا کام دیانت داری سے نہ کرنا......وغیرہ وغیرہ

س: اس میں بعض چیزوں کی حرمت پر خود علما کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے آپ نے انہیں بھی محرمات کی قبیل میں شمار کرلیا ہے۔ کہیں یہ غیر ضروری تشدد تو نہیں؟

ج: اوّل تو یہ روایتی معنوں میں اس طرح کے اختلافی مسائل نہیں جن میں ہر فریق کو یہ احتمال ہوتا ہے کہ دوسرا بھی صحیح ہوسکتا ہے۔ جدید دنیا میں مسلمانوں کا ایک بڑا

المیہ یہ ہے کہ اخلاقی،تہذیبی اور معاشرتی معاملات میں علما کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو انسانی زندگی کے بارے میں دینی موقف کو سمجھنے کی یا تو اہلیت نہیں رکھتا یا اس حمیت سے محروم ہے جس کے بغیر دینی سوچ پنپ نہیں سکتی۔ مذکورہ بالا مسائل میں امت کے مجموعی موقف سے اختلاف یا انحراف کرنے والے لوگ اسی قبیل سے ہیں۔ان لوگوں کے نزدیک دنیاوی ترقی اور خوشحالی گویا مدارِحق بن گئی ہے اور دین سے پیدا ہونے والی انسانی تہذیب اوراس کے بنیادی عوامل ان حضرات کی نظر سے بالکل اوجھل ہیں یا پھر یہ ان کی طرف دیکھنے سے کتراتے ہیں۔ البتہ حسن ظن کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ہم اپنے مشاہدے اور تجربے کے برعکس، یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ بعض ایسے علما بہر حال ہو سکتے ہیں جو حق طلبی اور حق جوئی کی نیت رکھنے کے باوجود بعض مہلک غلطیوں میں پڑ گئے ہوں،تاہم اصول کی بات یہی ہے کہ امت کو اگر اپنی ہیئت اجتماعی کو برقرار رکھنا ہے تو پھر مشتبہات کے پھیلاؤ سے بھی بچنا پڑے گا۔اس کے بغیر دین اپنی قطعیت کے ساتھ انسانوں میں سرایت نہیں کر سکتا۔

س: کسب حرام کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: ا۔انسان کے جوہر میں غیرت اور حیاء کا ایک مادہ ہوتا ہے،رزق حرام سے پہلی ضرب اسی پر پڑتی ہے۔ یہ بات محتاج دلیل نہیں کہ ایک دینی شخصیت کی تشکیل میں حمیت اور عفت ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔کسب حرام سے یہ ستون گر جاتے ہیں۔

۲۔ حرام کمائی کے نتیجے میں معیار زندگی کے اندر جو بلندی پیدا ہوتی ہے وہ فخر اور تکبر کا یقینی سبب بنتی ہے۔حرام کی دولت اور املاک پر اکڑنا سچ پوچھیں تو اسلام سے

نکلنے کے مترادف ہے۔ اس میں اور ابوجہل کی اکڑ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۔ شرک اور تکبر کے بعد اسلام جس چیز کو پہلے ہی قدم پر ختم کرنے کا تقاضا کرتا ہے وہ حبّ دنیا اور حبّ مال ہے۔ اسلام اور حبّ دنیا اسی طرح متضاد ہیں جس طرح ایمان اور کفر۔ رزق حرام کمانے والا دین کے اس بنیادی ترین مطالبے یعنی حبّ دنیا کے ترک کو نہ صرف یہ کہ نظرانداز کرتا ہے بلکہ اس امّ المعاصی کو حالاً اور عملاً دین پر ترجیح دینے کا عادی بن جاتا ہے۔

۴۔ مسلمان اور رزق حلال میں وہی نسبت ہے جو مرد اور مردمی میں ہے۔ رزق حرام کی دلدل میں دھنسنے والا فتوت کے تمام اوصاف سے دست برداری اختیار کرتا ہے اور ایک ایسے نفسیاتی ٹائپ میں ڈھل جاتا ہے جہاں آدمی ہر چیز کا سودا کر سکتا ہے۔

۵۔ کسب حلال اور اس کے لیے کی جانے والی کوششیں آدمی کو بندگی کی فطری اسپرٹ کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ متعلق رکھتی ہیں۔ اس کی خلاف ورزی کرنے سے اللہ سے تعلق کی حقیقی اساس منہدم ہو جاتی ہے اور شکر، صبر، توکل وغیرہ جیسے اوصاف معدوم ہو جاتے ہیں۔

۶۔ اس کی نحوست تمام زیر کفالت افراد کو بھی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

۷۔ اس کا ہر دینی عمل یقیناً بے سود اور بے معنی ہو جاتا ہے۔

۸۔ دعا قبول نہیں ہوتی۔

۹۔ مال میں سے برکت اٹھ جاتی ہے۔

۱۰۔ عبادت میں دل نہیں لگتا اور ایمان کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: چونکہ یہ ارادی عمل ہے لہذا اس کا علاج بھی اختیاری ہے۔ یہ علاج بالکل سادہ ہے اور اس کے دو جز ہیں:

ا۔ توبۃ النصوح

۲۔ تمام حرام اموال واملاک سے فوری دست برداری اور ان سے جتنا فائدہ اٹھایا جا چکا ہو اس کا کفارہ۔

اس علاج میں ہرگز کوئی حرج اور مشقت نہ سمجھیں۔ آخرت میں جو پکڑ ہونی ہے اس کے مقابلے میں یہ کوئی چیز نہیں۔

۞۞۞

باب چہارم

ذہنی امراض اور ان کا علاج

بے یقینی

تشکیک

حیلہ جوئی

مکاری وعیاری

عبادت میں عدم یکسوئی

بے یقینی

حکم ربانی

—﴿......وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ﴾(التوبہ۹:۴۵)

ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں۔

—﴿......وَاِنَّنَا لَفِیْ شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَا اِلَیْهِ مُرِیْبٍ﴾(ھود۱۱:۶۲)

تم جس چیز کی طرف ہمیں بلاتے ہو اس کے بارے میں ہمیں شبہ ہے اور ہم سخت الجھن میں گرفتار ہیں۔

فرمان نبوی

—''عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ الصدیق قال: نظرْتَ اِلَی اَقْدَامِ الْمُشْرِکِیْنَ وَنَحْنُ فِیْ الْغَارِ وَهُمْ عَلٰی رُؤُوسِنَا فقلتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ اَنَّ اَحَدَهُمْ نَظَرَ تَحْتَ قَدَمَیْهِ لَاَبْصَرَنَا فقالَ: وَمَا ظَنُّکَ یَا اَبَا بَکْرٍ بِاثْنَیْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا''(۱)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، میں نے مشرکوں کے قدموں کی طرف دیکھا جب ہم غار ثور میں تھے اور وہ ہمارے سروں پر تھے۔ پس میں نے کہا، یارسول اللہ! اگر ان میں سے کوئی اپنے قدموں کی طرف دیکھ لے، تو یقیناً وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے ابوبکر! ان دو کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے کہ جن کا تیسرا اللہ ہو (یعنی ہم دو ہی نہیں بلکہ تیسرا ہمارے ساتھ اللہ ہے اور جن کے ساتھ اللہ ہو ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟)

(۱) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ (ثانی اثنین اذ ھما فی الغار)

بے یقینی کے اسباب

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے اور غالباً ہر دوسرے مسلمان کا ذاتی تجربہ بھی ہے کہ ہم جن چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ ہمارے یقین کا حصہ نہیں ہیں۔ ہمارا عقیدہ اس لحاظ سے غیر موثر ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کی پہنچ ہمارے اس مرکز تک نہیں ہے جہاں ہم کسی چیز پر ایسا یقین اور اعتماد پیدا کر لیں جس کو کسی طرح زائل نہ کیا جا سکے۔ یہیں سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو ہمیں ذہنی، طبعی اور عملی طور پر اس فضا کے تحت رکھتی ہے جو ہمارے اس مرکز سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہمارا عقیدہ یا علم ہمیں عمل پر نہیں اکساتا تو اس کا سب سے واضح مطلب یہ ہے کہ وہ عقیدہ یا علم ہمارے لیے ایک ایسی سطح پر لائق یقین نہیں ہے جس کو ہمارا روزمرہ کا شعور اپنی گرفت میں لے سکے۔ اکثر اوقات آدمی کا کسی چیز کو مان لینا اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ وہ اس چیز پر یقین بھی رکھتا ہے۔ ذہن بعض امور میں مختلف اسباب کی بنا پر سمجھوتا بھی کر لیتا ہے، یعنی اپنے آپ کو مشقت سے بچانے کے لیے یا حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے یا عرف عام کو مجبوراً قبول کر لینے کی بنا پر یا محض دوسروں کی دیکھا دیکھی انسانی ذہن اکثر مسلمات اور عقائد کو قبول کر لینے کا تاثر دیتا ہے درآں حالیکہ ذہن کی مرکزی قوت جو اپنے تسلیم کردہ خیالات وغیرہ کو انسان کی تمام استعداد پر نافذ کرتی ہے، اس عمل اثبات سے لاتعلق رہتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس صورت میں کسی چیز کو ماننے کا بیشتر ذہنی عمل ایک مضبوط فیصلہ نہیں بلکہ محض ایک سمجھوتا ہوتا ہے۔ دماغ جن چیزوں کو اہمیت نہیں دیتا انہیں کسی ردوقدح میں پڑے بغیر قبول کر لیتا ہے۔ پھر یہ چیزیں اپنی معاشرتی قدروقیمت کے مطابق اظہار تو پاتی رہتی ہیں لیکن چونکہ ذہن اندر سے قائل نہیں ہوتا اس لیے یہ انسانی زندگی کے بنیادی دھارے میں شامل نہیں ہوتیں۔ ہم لوگوں

میں سے اکثر کا یہی حال ہوتا ہے کہ مشقت سے بچنے یا دباؤ کو ٹالنے کے لیے دین کو اس کی تمام معلوم اور نامعلوم تفصیلات سمیت مان تو لیتے ہیں لیکن اسے اپنی شخصیت کی نشوونما کا واحد ذریعہ اور زندگی کی تنہا اساس بنانے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس صورت حال کی نقشہ کشی قرآن حکیم میں کئی جگہ کی گئی ہے ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یَاأَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ" (النساء ۴:۱۳۶)

"اے لوگو جو ایمان لانے کے مدعی ہو، سچ مچ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر"

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا، قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ...." (الحجرات ۴۹:۱۴)

"یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ اے نبی! ان سے کہیے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ محض مطیع ہوئے ہو اور ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا۔"

علم نفسیات کی رو سے یہ صورت حال دراصل ذہن کا تراشا ہوا ایک فریب ہے جس میں ہم خود کو اور دوسروں کو مبتلا رکھتے ہیں۔ اس طرح کا ایمان اور اقرار دراصل انکار نہ کر سکنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب سے دین کی قانونی تعبیر نے ہمارے اندر اجتماعی سطح پر ایک رسوخ پیدا کر لیا ہے، ہم دین سے وابستگی کی بعض لازمی شرائط فراموش یا نظر انداز کرنے کے عادی بن گئے ہیں۔ مسلمان ہونا یا نہ ہونا اب ایک فقہی مسئلہ بن کر رہ گیا ہے جو اکثر مقامات پر دین کی روح سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اگر ہم دینی فہم اور ذوق کے لیے صحابہ کو

معیار بنائیں تو غالباً یہ سمجھنے اور محسوس کرنے میں کوئی مشکل نہیں رہے گی کہ عمل ایمان کی تصدیق کا واحد معیار ہے۔عمل کے بغیر ایمان کسی بھی دلیل سے قابل تسلیم نہیں۔ہم جس چیز کو بے یقینی کہہ رہے ہیں وہ دراصل یہی ہے کہ ایمان محرک عمل نہ بن سکے،یعنی میں آخرت کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہوں لیکن میری دنیاوی زندگی اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتی۔ انسان میں یقین کے تمام درجات میں باہمی تفاوت تو ہوسکتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ اس کا عمل اس کے یقین کی مخالف سمت میں ہو۔ایسی صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ آدمی یقین نہیں رکھتا بلکہ یقین کے التباس میں مبتلا ہے۔ہم دوٹوک انداز میں اس پوری بات کا خلاصہ نکالنا چاہیں تو وہ یہ ہوگا کہ ایسا ایمان جسے عمل کی شہادت میسر نہ ہو ایمان نہیں بلکہ بے یقینی ہے۔

س: مذکورہ بالا گفتگو میں بے یقینی کے اسباب و محرکات کا ذکر آگیا ہے اس لئے ان کے اعادے کی ضرورت نہیں، تاہم اس کے چند بڑے بڑے مظاہر بتا دیے جائیں تو بات سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی؟

ج: ممکن ہے اوپر بیان کردہ تفصیلات کچھ لوگوں کے لیے آسانی سے قابل فہم نہ ہوں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نسبتاً سادہ لفظوں میں بتا دیا جائے کہ بے یقینی ذہن کی وہ حالت ہے جو عقیدے کو شعور کے لیے ایک رسمی چیز سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی اور ذہن جن مراحل سے گزر کر اور جس طرح کی قوت تسلیم کے ساتھ سامنے کی چیزوں پر ایک اٹل یقین پیدا کرتا ہے وہ عقائد کے باب میں مفقود ہوتے ہیں۔اس سطح پر دماغ کسی وجہ سے اقرار تو کر لیتا ہے مگر اس اقرار کو ارادہ و عمل کا مقصود بننے کی اہلیت فراہم نہیں کرتا۔ذہن کا یہ نام نہاد اقرار عموماً مندرجہ ذیل اسباب سے پیدا ہوتا ہے:

- بے پروائی
- نااہلی
- معاشرتی دباؤ
- مشقت سے گریز کا داعیہ
- رسمی تقلید

اب ہم اس کے مظاہر کی طرف آتے ہیں جو یہ ہیں:

- خودرائی
- بے عملی
- تقدیر پرستی، اور
- تجدد پسندی

ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی تفصیلات ہیں:

خودرائی: ایمان کے بارے میں غیر سنجیدہ لوگ خودرائے ضرور ہوتے ہیں۔ ان کی رائے بھی ان کی خواہش کے تابع ہوتی ہے اور اسے وہ جب چاہیں بدل لیتے ہیں۔ اس طرح کا رویہ، ظاہر ہے، کہ ایمان کی ماہیت سے متصادم ہے۔ ایمانیات مفہوم اور تعبیر کی سطح پر بھی زیادہ سے زیادہ غیر متغیر ہوتے ہیں۔ انہیں اگر تبدیلی کی لہر میں چھوڑ دیا جائے تو یہ ذہن کے ایجاد کردہ تصورات بن کر رہ جائیں گے۔ خودرائے آدمی کا ذہن دراصل ایمان کی صورت برقرار رکھتے ہوئے اس کے معنی تبدیل اور مسخ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور اس طرح سے اپنی اس مجبوری کا ازالہ کرتا ہے جو اس نے کسی داخلی یا خارجی دباؤ کی وجہ سے خود پر عائد کر رکھی ہو۔

بے عملی: بے عملی کا معاملہ واضح ہے اس میں کسی تفصیل کی حاجت نہیں۔

تقدیر پرستی: یہ دراصل ایمان کی عائد کردہ ذمہ داری سے بچنے کا ایک بڑا بہانہ ہے۔ باقی اس کی تمام تر مناسبت بے عملی کے ساتھ ہی ہے۔ اس کے ذریعے سے بے عملی پر بھی استدلال ہو جاتا ہے اور حقیقی ایمان کی غیر موجودگی پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے۔

تجدد پسندی: تجدد پسندی اور خود رائی بنیادی طور پر ایک ہی رویے کے دو نام ہیں۔ فرق یہ ہے کہ خود رائی سے معنی بدلتے ہیں اور تجدد پسندی سے صورت۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی طور پر خود رائی کا ہدف قرآن ہوتا ہے اور تجدد پسندی کا سنت۔

س: بے یقینی کے نقصانات کیا ہیں؟

ج: بے یقینی بجائے خود اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دینی نقصان سوچا بھی نہیں جا سکتا، تاہم نفسیاتی نقطۂ نظر سے بے یقینی کی حالت انسانی شخصیت میں ایسے نقائص پیدا کر دیتی ہے جو دینی اعتبار سے بھی مہلک ہیں مثلاً:

۱۔ نفاق

۲۔ ریا

۳۔ جھوٹ

۴۔ کم عقلی

۵۔ بعض ضروری انسانی اوصاف مثلاً غیرت، بہادری، مجاہدہ، بلند اخلاقی وغیرہ سے محرومی۔

۶۔ انسان کو اپنے آپ پر گرفت لازماً درکار ہے، بے یقینی اسے قائم نہیں رہنے دیتی۔ یہ ایسی خامی ہے جس کی موجودگی میں انسان ہونا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

س: بے یقینی کا علاج کیا ہے؟

ج: بے یقینی کی عموماً دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک تو وہ جس کی بنیاد عقل اور عقل کے مروجہ استدلال پر ہو اور دوسری قسم وہ ہے جو ایک وہم اور وسوسے کی طرح ذہن پر غالب آجاتی ہے۔ پہلی قسم یعنی مدلل بے یقینی کا بظاہر تو یہی علاج نظر آتا ہے کہ دلیل کا جواب دلیل سے دیا جائے لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ عقل ایک بار جو دلیل گھڑ لیتی ہے پھر کسی اور استدلال کے مقابلے میں اس سے دستبردار نہیں ہوتی۔ یہاں دلیل سے ہمارا مطلب ہے کسی غائب چیز کا عقلی اثبات یا انکار۔ حق کے سلسلے میں عقل کا اثبات ہو یا انکار، بہت زیادہ لائق اعتماد نہیں۔ اس کی تفصیل چونکہ بہت تکنیکی ہے لہذا اس میں پڑنے کی بجائے ہم اپنی بات اس طرح کہیں گے کہ بے یقین ذہن کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اس کا عقل اور عقلی استدلال پر انحصار ختم کر دیا جائے یعنی عقل کو حَکَم کی بجائے شارح وغیرہ کے منصب پر رکھا جائے تو دین میں جس سطح کا اقرار یا انکار مطلوب ہے اس کا حصول ذہن کے لیے فطری اور آسان ہو جاتا ہے۔ حق ذہن کی فطری استعداد سے ثابت ہوتا ہے نہ کہ عقلی قوت سے۔ ذہن کا عقل پر انحصار ختم کرنے کے لیے پہلے اسے اس دعوے کی طرف متوجہ کرنا چاہیے کہ عقل غیب پر کوئی حکم نہیں لگا سکتی، کیونکہ عقل کا تعلق محض محسوسات سے ہے۔ اگر یہ دعویٰ ذہن پر ثابت ہو جائے تو بے یقینی کی اس قسم کا علاج سہولت کے ساتھ ممکن ہو جائے گا۔

نیز امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ کی بعض تحریریں (جیسے احیاء العلوم، تہافتہ الفلاسفہ، الرد علی المنطقیین وغیرہ) اس معاملے میں فیصلہ کن افادیت رکھتی ہیں۔ کم و بیش یہی مرتبہ متاخرین میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بعض تحریروں (مثلاً اسلام اور عقلیات وغیرہ کا) ہے۔ ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چونکہ اس طرح کی بے یقینی میں مبتلا حضرات فلسفیانہ

ذوق کے بھی حامل ہوتے ہیں اس لیے مناسب ہوگا کہ ایمانوئل کانٹ کی مشہور کتاب The Critique of Pure Reason (تنقیدِ عقلِ محض) کا غور سے مطالعہ کرلیا جائے۔ اس کتاب میں عقل کی دینی مداخلت کی تمام صورتوں کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا گیا ہے۔

بے یقینی کی دوسری قسم شبہ، وہم اور وسوسہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ آدمی دین پر پختہ ایمان رکھتا ہو مگر کسی عقیدے یا حکم کے صحیح معنی اور مصلحت نہ سمجھنے کی وجہ سے شبہے اور وسوسے میں مبتلا ہو جائے۔ یہ شبہہ عقلی بھی ہوسکتا ہے اور طبعی بھی۔ اس کا علاج سادہ ہے۔ شبہہ کی وجہ عقلی ہو تو کسی موثر استدلال سے دور کر دینا چاہیے اور اگر طبعی ہو تو دین کے بنائے ہوئے مزاج اور اس کے کامل نمونوں کی سند پر اس خلجان کا آسانی سے ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مسلمان آفات و مصائب کی بھرمار سے متاثر ہو کر اللہ کی رحمت کی طرف سے شبہے کا شکار ہو جاتا ہے، ایسے شخص کو رحمت کے تفصیلی معانی سمجھا کر اس شبہے سے نکالا جاسکتا ہے یا کوئی آدمی اپنی یا مسلمانوں کی مسلسل ناکامی اور بدحالی سے گھبرا کر پورے دین کی طرف سے ایک نامعلوم وسوسہ محسوس کرنے لگتا ہے، اس کے سامنے رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کا انداز زندگی رکھ دیا جائے تو اس کی یہ طبعی الجھن باقی نہیں رہے گی۔

یہاں ہم نے بالکل اجمال سے کام لیا ہے کیونکہ ہمارے پیش نظر محض یہ دکھانا تھا کہ مسلمان رہتے ہوئے بھی کوئی شخص دین کے کسی جز پر مشتبہ ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت اس کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے اور وہ دل سے چاہتا ہے کہ اس کا ازالہ ہو جائے۔ یہی آمادگی علاج کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ یہ میرا شبہ ہے یا اشکال ہے، لیکن دراصل وہ لوگ دین پر اعتراض کر رہے ہوتے ہیں۔ چونکہ اشکال اور اعتراض صورتاً ایک جیسے ہوتے ہیں اس لیے وہ اس یکسانی سے فائدہ

اٹھا لیتے ہیں۔ شبہے اور اعتراض میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ شبہے میں مبتلا ہونے والا شخص پریشان، مضطرب اور غمگین ہوتا ہے جبکہ معترض ایک طرح کا فاتحانہ تیقن رکھتا ہے۔ سردست ہمارا مقصود معترضین اور ان کے اعتراضات کا تجزیہ نہیں ہے اس لیے ہم اسے چھوڑتے ہیں یہاں تک کہ گفتگو کا کوئی مناسب موقع نکل آئے۔

مختصر یہ کہ شبہ اور وسوسہ ایمان ہی کی نشانی ہے۔ اس کے علاج کے لیے حکمت، نرمی، اور خیر خواہی درکار ہے، سختی اور ردّ سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ تو ایک مریض کی وہ حالت ہے جو وہ خود اپنے علاج کے لیے بیان کرتا ہے۔ یہ حالت اس کے ایمان اور اسلام میں کسی نقص کا ثبوت نہیں ہے محض کسی ذہنی کمزوری یا ناسمجھی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

❖❖❖

تشکیک

حکم ربانی

۔﴿ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْجَمَعُوْالَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًاوَّقَالُوْا حَسْبُنَااللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْارِضْوَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُوْفَضْلٍ عَظِیْمٍ﴾ (آل عمران۳:۱۷۳،۱۷۴)

یہ وہ ہیں جنہیں لوگوں نے خبر دی کہ دشمن نے تمہارے خلاف بڑی طاقت جمع کر لی ہے، اس سے ڈرو لیکن اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بول اٹھے کہ ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ پھر وہ نکلے اور اللہ کی نعمتیں اور اس کا فضل سمیٹ کر واپس آئے۔ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا۔ وہ اللہ کی رضامندی پر چلے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

۔﴿وَاِذَاقِیْلَ اِنَّ وَعْدَاللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَارَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّانَدْرِیْ مَاالسَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَانَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ﴾ (الجاثیہ۴۵:۳۲)

اور جب تمہیں کہا گیا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم نے کہا ہم نہیں مانتے قیامت کیا ہے؟ اور ہم اس کے آنے کے بارے میں متردد ہیں اور ہمیں یقین نہیں کہ وہ آئے گی۔

فرمان نبوی

”عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللّٰہ عنہما قال: حَسْبُنَااللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ، قَالَهَا اِبْرَاهِیْمُ علیہ حِیْنَ اُلْقِیَ فِی النَّارِ، وَقَالَهَامُحَمَّدٌ ﷺ حِیْنَ قَالُوْا: اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَقَالُوْا: حَسْبُنَااللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ“(۱)

(۱) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ آل عمران، باب ﴿ان الناس قدجمعوا لکم فاخشوھم﴾

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسبنا اللہ ونعم الوکیل (ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے) اس وقت کہا جب انہیں آگ میں ڈالا گیا اور حضرت محمد ﷺ نے بھی یہ کلمہ اس وقت کہا جب کافروں نے کہا کہ بے شک لوگ تمہارے مقابلے کے لیئے جمع ہوگئے ہیں، ان سے ڈرو! پس اس بات نے ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا اور انہوں نے کہا: حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

س: دیکھنے میں آیا ہے کہ جدید تعلیم کے زیر اثر عقائد وغیرہ میں کچھ شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں جنہیں جدید تعلیم یافتہ ذہن یا تو حل کرنے پر قادر نہیں ہوتا یا پھر ان کی طرف ایک میلان پیدا کر لیتا ہے۔ یہ خرابی یعنی تشکیک ہماری رائے میں تیزی سے پھیل رہی ہے لہذا اس کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے؟

ج: تشکیک بے یقینی ہی کی ایک قسم ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بے یقینی کا بڑا حصہ اسی پر مبنی ہوتا ہے۔ تشکیک کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن امور کو فہم عام کی روشنی میں سمجھ نہ سکے یا حواس کی مدد سے انہیں محسوس نہ کر سکے، ان امور کے بارے میں جب وہ انکار کی دلیل یا طاقت نہیں پاتا تو ان کے حوالے سے ایک گہرے تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ عام طور پر یہ تذبذب دو چیزوں خوف اور خواہش کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں میں خوف نہ ماننے کا ہوتا ہے اور خواہش ماننے کی، جبکہ بعض میں یہ ترتیب الٹ بھی ہوسکتی ہے یعنی انسان کسی ماورائے عقل وحواس چیز کو ماننا یا نہ ماننا چاہتا ہے مگر اس کے نتائج سے خوفزدہ بھی ہوتا ہے۔ تشکیک کے مرض میں مبتلا لوگوں کی عموماً دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک وہ جنہیں ایمانیات پر خود کو قائل کر دینے والی دلیل نہیں ملتی اور دوسرے وہ جو ایمانیات کا

استدلال سمجھنے کے لائق نہیں ہوتے۔ بالفاظ دیگر شک میں یا تو ذہین آدمی مبتلا ہوتا ہے یا پھر بالکل ہی احمق۔

جدید تعلیم خصوصاً موجودہ سائنسی اور عقلی علوم نے ذہن اور طبیعت کا ایک خاص مزاج بنا دیا ہے۔ اس مزاج کا خاصہ یہ ہے کہ یہ غیب اور کسی مطلق اتھارٹی کو قبول نہیں کرتا۔ آخرت، رسالت اور خدا اس کے تصور علم اور خوئے اثبات سے مناسبت نہیں رکھتے۔ جدید سائنس گو کہ مذہبی عقائد کے معاملے میں خاموشی کا رویہ اختیار کرتی ہے لیکن اس کا تصور کائنات اور انداز تحقیق ایسا ہے کہ آگے چل کر کسی بھی مرحلے میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی ایسے مقام پر پہنچے گی جہاں عقائد کے اثبات کی راہ کھل سکتی ہو۔ اس کی پیش رفت کی ہر سمت مذہب کے عین مخالف ہے۔ اسی طرح سے نظری علوم مثلاً فلسفہ وغیرہ متفقہ طور پر ایک تصور علم رکھتے ہیں جس میں ان حقائق کے لیے کوئی جگہ نہیں جو مابعد الطبیعی یعنی عقل وحواس اور زمان و مکاں سے ماوراء ہوں۔ ان کی رو سے وہی حقیقی ہے جو محسوس ہو۔ محسوسات سے اوپر اٹھ کر کسی چیز کو موجود ماننا محض ایک واہمہ ہے۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ جدید تعلیم اور اس کا پورا نظام جن بنیادوں پر کھڑا ہے وہ دین سے براہِ راست متصادم ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں کیونکہ گفتگو ادق ہو جائے گی۔ اس لیے ہم صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس نظام تعلیم نے مجموعی طور پر جو ذہنیت اور طبیعت پیدا کی ہے وہ واضح طور پر دینی عقائد اور اخلاق کی قبولیت کی ابتدائی استعداد بھی نہیں رکھتی، کیونکہ اس کا بنایا ہوا تصور انسان اور تصور کائنات خدا اور آخرت وغیرہ پر ایمان کو عملاً محال بنا دیتا ہے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری دینی فکر ہر لحاظ سے پسماندہ ہے اور ذہن جدید میں اٹھنے والے شبہات اور علوم جدیدہ کے اٹھائے ہوئے سوالات کا سامنا کرنے کی سکت نہیں

رکھتی۔ ہمارا سارا نظام استدلال فرسودہ اور بے اثر ہے۔ یہ جس منطق پر کھڑا ہوا ہے وہ پوری طرح رد ہو چکی ہے لیکن افسوس کہ دین میں عقل کے کردار کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والے، معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے سے بے خبر ہیں۔ اس صورت حال میں تشکیک کا ہر عمل یک طرفہ طور پر شدت پکڑ لیتا ہے کیونکہ اس کے آگے بند باندھنے کی کوئی صلاحیت اور قوت معاصر دینی فکر میں موجود نہیں ہے۔ ہم نے جدید علما اور دینی مفکرین کی نمائندہ چیزیں دیکھ رکھی ہیں۔ ہم عقیدگی اور ہم خیالی کے باوجود ان کے بارے میں ہمارا تاثر یہی ہے کہ ادنیٰ درجے کی تیاری اور اہلیت کے بغیر ایک بڑے نازک معاملے میں ہاتھ ڈال دیا گیا ہے اور نتیجتاً دین کی جگ ہنسائی کا ذریعہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ ہماری رائے میں جدید مذہبی تحریریں، خاص طور پر وہ تحریریں جو مذہب کے عقلی دفاع میں لکھی گئی ہیں، بالکل بچگانہ ہیں اور تشکیک کو کم کرنے کی بجائے بڑھا دیتی ہیں۔ اب معاملہ یہ ہے کہ عقل نے اپنی انتہائی ترقی یافتہ حالت میں پوری قوت اور تیاری کے ساتھ مذہب کے انکار کا رویہ اختیار کر لیا ہے۔ جدید مسلمانوں میں پیدا ہونے والی تشکیک اسی کی ایک پرچھائیں ہے۔ دوسری طرف مذہبی فکر میں جو عقل کارفرما دکھائی دیتی ہے وہ ہر اعتبار سے کمزور، ناقص اور بے ساز و سامان ہے۔ اس عدم توازن سے نمٹنے کا سر دست کوئی ایسا فارمولا نہیں ہے جسے اجتماعی طور پر آزمایا جا سکے۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس لے دے کر ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہم اس بنیادی نکتے کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ وحی دراصل عقل کی ناکامی اور کوتاہی کو ہویدا کرتی ہے۔ عقل اپنے طور پر نہ حقیقت عالم سمجھ سکتی ہے، نہ نظام عالم چلا سکتی ہے اور نہ انسان کے اخلاقی اور غیر مادی مطالبات اور ضروریات کی تکمیل کر سکتی ہے۔ عقل کے بارے میں یہ تمام دعوے محض الزامات نہیں ہیں بلکہ خود جدید علوم ان کی تائید کرتے ہیں۔ اندریں صورت

مذہبی ذہن کی تشفی اور مضبوطی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ایمانیات عقل کے دائرے میں نہیں آتے۔ عقل کا تعلق محض عالم محسوسات سے ہے، جس کی تحقیق و تفتیش کی ذمہ داری دین نے اپنے اوپر نہیں لی۔ گویا دین اور عقل اپنے اہداف و مقاصد میں کسی بھی مرحلے پر ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہیں رکھتے۔ جس طرح زمین کی حرکت یا سکون قرآن سے نکالنا غلط ہے اسی طرح خدا کا وجود محض عقل کی عینک لگا کر ڈھونڈنا بھی غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل کا نکتۂ آغاز ہمیشہ کوئی نہ کوئی مفروضہ ہوتا ہے جس سے وہ سمجھوتہ کر کے اپنی سمت عمل متعین کرتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ یہ ماتحتی جو عقل کی بناوٹ میں داخل ہے دینی امور میں بھی برقرار رہنی چاہیے۔ یہ از روئے عقل بھی ایک فطری بات ہوگی۔

❂❂❂

حیلہ جوئی

حکم ربانی

۔۔﴿فَاِنْ طَلَّقَهَافَلَاتَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًاغَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِمَااَنْ يَّتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّااَنْ يُّقِيْمَاحُدُوْدَ اللّٰهِ......﴾

(البقرہ۲:۲۳۰)

اور اگر شوہر نے تیسری طلاق دی تو پھر جدائی ہوگئی۔اب وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں لیکن اگر وہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے اور پھر وہ اپنی مرضی سے اسے طلاق دیدے تو ایسی صورت میں پہلے شوہر سے اس عورت کا دوبارہ نکاح جائز ہے، بشرطیکہ دونوں کو اللہ کی حدود پر قائم رہنے کی توقع ہو۔

فرمان نبوی

”الااخبركم بالتيس المستعار؟قالوا:بلى يارسول الله(ﷺ) قال:هوا المحلل ، لعن الله المحلل والمحلل له“(۱)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں کرائے کے سانڈ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں یارسول اللہ (ﷺ)؟ آپؐ نے فرمایا: وہ حلالہ کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے جو حلالہ کرے اور کروائے دونوں پر۔

---

(۱)سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب المحلل والمحلل له

حیلہ جوئی یا بہانے بازی ایک ایسا مرض ہے جو اخلاقی بھی ہے اور نفسیاتی بھی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ آدمی کے پورے اندرونی اسٹرکچر کی کسی بڑی خرابی پر دلالت بھی کرتا ہے۔ یعنی حیلہ جو شخص کسی جزدی خرابی میں نہیں بلکہ مکمل بگاڑ میں مبتلا ہوتا ہے۔ انسانوں میں اس طرح کے بگاڑ کی ایک قسم یہ ہے کہ کسی چیز کے ساتھ سچی وابستگی کی شرائط پوری کرنے سے پہلوتہی کی جائے۔ انسانوں کو جتنی خرابیاں لاحق ہوسکتی ہیں ان میں سب سے بنیادی خرابی وہی کہلائے گی جو اس کی صلاحیت تعلق میں فساد پیدا کرے۔ حیلہ جوئی ایسی ہی ایک خرابی ہے۔ اس میں مبتلا شخص بالکل غیر مبہم انداز میں یہ اظہار کرتا ہے کہ وہ دین سے سچا اور سنجیدہ تعلق نہیں رکھتا یا نہیں رکھنا چاہتا۔

حیلہ جوئی کی تعریف یہ ہے: گناہ اور غلطی کی طرز ادائی میں کوئی غیر معمولی تبدیلی کر کے ایک چالاکی کے ساتھ اسے قانونی اعتبار سے قابل قبول بنا لینا۔ یعنی حیلہ یہ ہے کہ خوب دھڑلے سے گناہ کرو کہ نعوذ باللہ خود اللہ چکرا جائے اور مجبور ہو جائے کہ اسے گناہ نہ سمجھے۔ اس منطق کی لغویت بلکہ شیطنت اتنی ظاہر ہے کہ اسے رد کرنے کے لیے کوئی دلیل لانے کی بھی ضرورت نہیں۔ خالص دینی معاملات کے علاوہ دیگر معاشرتی معاملات وغیرہ میں بھی یہ بیماری طرح طرح سے ظہور کرتی ہے۔ وعدہ خلافی کر کے بہانے گھڑنا، کام چوری کے طریقے ڈھونڈنا، اپنی خرابیوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنا، غرض جھوٹ کو سچ بنانے کا ہر عمل اسی کا مظہر ہے۔

س: آپ نے فقہی حیلہ جوئی اور عمومی بہانے بازی کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا ہے. بلکہ زیادہ واضح لفظوں میں انہیں ایک ہی بیماری قرار دیا ہے اور ایک ہی خرابی کے دو پہلو باور کرایا ہے، جب کہ بظاہر ان میں خاصا فرق نظر آتا ہے؟

ج: ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ بظاہر یہ دو مختلف خرابیاں معلوم ہوتی ہیں تاہم اپنے ظاہری روپ میں بھی ان کے درمیان کچھ گہری مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ہم نے اس امتیاز یا مماثلت پر تکیہ نہیں کیا بلکہ ایک نفسیاتی حقیقت بتائی ہے کہ فقہی حیلہ جوئی اور عمومی بہانے بازی کا مبدء اور محرک ایک ہوتا ہے۔نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک ہی مرض کے دو اظہار ہیں۔آپ اگر ذرا غور سے دیکھیں تو آسانی سے پتہ چل جائے گا کہ دونوں میں بنیادی چیزیں مشترک ہیں، مثلاً تعلق میں سچا نہ ہونا، ذمہ داری سے بھاگنا، غیر سنجیدہ پن، جھوٹ، دھوکا، چالاکی وغیرہ۔ مطلب یہ کہ دونوں کی تعمیر یکساں عناصر سے ہوئی ہے۔حیلہ کر کے آدمی دین میں ان سب اوصاف کا مظاہرہ کرتا ہے اور بہانہ گھڑ کے دنیا میں۔ویسے آپ کی آسانی کے لیے ان کی ایک مشترک بنیاد بتائی جا سکتی ہے تاکہ پوری یکسوئی کے ساتھ ان کی ماہیت سمجھ میں آسکے۔وہ مشترک بنیاد ہے: جھوٹ کو سچ بنانا۔

س: بڑے بڑے علما حیلے کے قائل ہوئے ہیں اور تا حال ہیں، آپ کی یہ بات ان کے موقف سے متصادم نظر آتی ہے؟

ج: آپ نے بہت برمحل سوال کیا۔ہم اسی کی طرف آنے والے تھے۔دیکھیے! حیلہ جوئی اور چیز ہے اور فقہی حیلہ اور چیز۔حیلہ جوئی ایک بڑی انسانی خرابی ہے مگر کسی خاص صورتحال میں گھر جانے پر مجبوراً کسی حیلے پر عمل کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ بعض اوقات ضروری بھی ہو جاتا ہے۔دین میں حیلے کا مطلب ہے شدید عذر

کی حالت میں خود دین کی دی ہوئی رخصت اور لچک سے فائدہ اٹھانا۔ظاہر ہے کہ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ بعض حالات میں ناجائز عمل کا عدم جواز ساقط ہوجاتا ہے مثلاً کسی مسلمان کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول دینا وغیرہ۔ بلکہ یہ تو قرآن سے ثابت ہے (دیکھیے النحل ۱۶:۱۰۶ وص ۳۸:۴۴)، ہمارا کہنا یہ ہے کہ حیلے کی ضرورت ناگہانی طور پر پیش آتی ہے۔آدمی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ حیلے کے جھوٹے سچے مواقع تلاش کرتا پھرے۔ایسا کرنا شریعت کے ساتھ مذاق کے مترادف ہوگا اور یہی حیلہ جوئی ہے۔

س: دین کی دی ہوئی رخصت اور لچک سے فائدہ اٹھانے والی آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی؟

ج: سامنے کی بات ہے کہ جیسے حالت اضطرار میں مردار کھانا جائز ہوجاتا ہے (البقرہ ۲:۱۷۳)، اسی طرح جھوٹ بولنا وغیرہ بھی جرم نہیں رہتا۔لیکن اضطرار کا التباس پیدا کرکے حرام کو حلال بنالینا بدترین نافرمانی ہے۔مثال کے طور پر شریعت کا قانون ہے کہ طلاق یافتہ عورت کا اگر دوسرے نکاح میں بھی نباہ نہ ہوسکے تو وہ طلاق لے کر پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے۔اس قانون کی بنیاد پر حلالے کا پورا ضابطہ گھڑ لیا گیا۔ہم یہ نہیں کہتے کہ حلالے کا تصور اپنے ہر جز میں اور ہر صورت حال میں غلط ہے، تاہم اسے جس طرح ایک عمومی ضابطے کی شکل دے دی گئی ہے وہ اس کو قابل قبول حیلہ نہیں رہنے دیتی کیونکہ حلالے کو ایک مستقل ضابطہ مان لیا جائے تو عورت کے نکاح ثانی کا شرعی قانون خود رائی اور نفس پرستی کی نذر ہوجائے گا۔یہی کیفیت بعض دوسرے فقہی حیلوں کی بھی ہے۔مختصر یہ کہ جائز حیلہ مقاصد شریعت کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے اور اس میں ضروری ہے کہ

اصلی حکم کی روح برقرار رہے۔ حلالے وغیرہ کی صورت میں وہ روح مردہ ہو جاتی ہے۔

س: حیلہ جوئی پر آپ کی گفتگو وضاحت کے ساتھ آ گئی۔ گو کہ بہانے بازی اور اس کے مظاہر واضح ہیں تاہم اس سلسلے میں بھی آپ کچھ ضروری باتیں بیان کر دیں تو بہتر ہوگا؟

ج: بہانے بازی کی تعریف اوپر بیان کی جا چکی ہے اور اس کے مظاہر بہت معروف ہیں، اس لیے ہمارا خیال ہے کہ اس کے دینی اور نفسیاتی ضرر کی نشاندہی کر دی جائے۔

انسان کی ساری بندگی انسان کی قوت تعلق پر منحصر ہے۔ یہ قوت کمزور پڑ جائے تو بندگی کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس میں نقص پیدا ہو جائے تو انسان اپنی کلّیت میں ناقص ہو جاتا ہے۔ ہماری تمام صلاحیتیں دراصل اسی قوت تعلق کی تکمیل اور تشکیل کرتی ہیں۔ بہانے بازی کی عادت اسی اہم ترین اور بنیادی ترین وصف کو مجروح کر دیتی ہے۔ نتیجتاً انسانی کمالات کی تمام سطحیں، خواہ دینی ہوں یا نفسیاتی یا معاشرتی، متاثر ہو جاتی ہیں۔ یہی ایک اتنا بڑا نقصان ہے کہ باقی نقصانات کی لمبی فہرست بھی اس کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اصل نقصان تو یہ ہے باقی اسی کی تفصیل ہے مثلاً خودغرضی، مکاری، بے وفائی، جھوٹ، فریب، نفس پرستی، کسل، وعدہ خلافی وغیرہ۔

س: اس کا علاج کیا ہے؟

ج: حیلہ جوئی اور بہانے بازی کا تعلق ان خرابیوں سے ہے جنہیں آدمی قصداً اختیار کرتا ہے لہٰذا ان سے چھٹکارا پانا بھی اختیاری ہوگا۔ مندرجہ ذیل تدابیر پر عمل کرنے سے اس خرابی کا علاج ممکن ہے:

- کسی بھی قیمت پر وعدہ خلافی نہ ہونے دینا
- ہر حال میں سچ بولنا
- محنت کی عادت ڈالنا
- لوگوں کے ایسے کام کرنا جن میں اپنا کوئی مفاد نہ ہو
- نماز کی پابندی کرنا
- کبھی کبھی نفلی روزے رکھنا

مکاری وعیّاری

حکم ربّانی

— ﴿بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ، وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ (الرعد۱۳:۳۳)

(اصل بات یہ ہے کہ) کافروں کی نگاہوں میں ان کی مکاریاں خوشنما بنا دی گئی ہیں۔ وہ راہِ حق سے محروم ہیں اور جسے اللہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

— ﴿...... وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ......﴾ (فاطر۳۵:۱۰)

(اور اے نبیؐ!) جو لوگ آپ کے خلاف مکر رہے ہیں (یعنی بری چالیں چل رہے ہیں) ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

فرمان نبوی

— ''ملعون من ضار مومناً او مکر به''(۱)

جو کسی مومن کو نقصان پہنچائے اور اس کے ساتھ مکر کرے وہ لعنتی ہے۔

— ''من ضار ضار اللّٰه به ، ومن شاق شاق اللّٰه علیه''(۲)

جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے گا، اللہ اسے نقصان پہنچائے گا اور جو کسی مسلمان کے ساتھ سختی کرے گا اللہ اس پر سختی کرے گا۔

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب البرّ والصلہ، باب ماجاء فی الخیانہ

(۲) جامع الترمذی، کتاب البرّ والصلہ، باب ماجاء فی الخیانہ

مکاری اصل میں سچ کی آڑ میں جھوٹ کی پرورش کرنے کا نام ہے، یعنی مکار آدمی وہ ہوتا ہے جو اپنے کسی غلط مقصد کو حاصل کرنے کے لیے صحیح باتوں کا سہارا لے۔ گویا مکر کا شجرہ جھوٹ، فریب اور نفاق سے ملتا ہے بلکہ اس میں یہ تینوں خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ نیز مکاری کا ایک گہرا تعلق دنیا پرستی سے بھی ہے۔ مکار شخص اصلاً دنیا پرست ہوتا ہے اور اس کی ساری تگ و دو کا محور دنیا ہی ہوتی ہے۔ دنیاوی نقصان سے بچنا اور دنیاوی فائدے حاصل کرنا اس کا بنیادی ہدف ہوتا ہے۔ مکاری میں کم از کم دو چیزیں مذکورہ بالا خرابیوں کے مقابلے میں زائد ہوتی ہیں۔ ذہانت اور سفاکی۔ اہل مکر ذہین اور ظالم ہوتے ہیں۔ مکر کا شمار ان خرابیوں میں کرنا چاہیے جو آدمی ارادے اور شعور کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ اسی لیے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ فلاں آدمی جھوٹ یا نفاق میں مبتلا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مکر اور عیاری میں مبتلا ہے۔ یہ جملہ ہی غلط ہے۔ اس لیے مکاری کے علاج کی تدبیریں بتانا بے معنی ہے۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ ہم مکر کا زور توڑنے کی چند صورتیں نکال لیں اور انہیں عمل میں لائیں تا کہ کسی مکار آدمی کا مکر ہم پر نہ چل سکے۔ نفسیاتی اعتبار سے مکار آدمی کی اصلاح تقریباً ناممکنات میں سے ہے، یعنی کسی کو مکاری سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرنا محال ہے۔ چونکہ مکاری بے حسی کی انتہا کا نام ہے لہذا ایسا آدمی کوئی اثر قبول کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کے مکر کا پردہ چاک بھی ہو جائے تو بھی وہ شرمندہ اور تائب ہونے کے بجائے دوسری چالیں سوچنے لگتا ہے۔ اس کے ردعمل کا یہ انداز لامتناہی

ہے۔مکار آدمی میں تبدیلی پیدا ہونے کی بس دعا ہی کی جا سکتی ہے، کوشش کارگر نہیں ہوتی۔

س: اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی مکار آدمی میں کوئی تبدیلی پیدا ہونے کی کوئی امید نہیں اور یہ بھی کہ اس میں خود کو بدلنے کی خواہش بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔کیا آپ کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا؟

ج: جی ہاں! ہم نے یہی کہا ہے مگر ایک اضافے کے ساتھ اور وہ یہ کہ مکار آدمی کے اندر تبدیلی کسی تدبیر سے پیدا نہیں ہو سکتی البتہ بشرط قبولیت دعا سے ضرور پیدا ہو سکتی ہے۔اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ جس کا دل چاہے پھیر دے۔

س: ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر مکر میں ایسی کیا بات ہے کہ اس کا ازالہ کسی بھی تدبیر سے نہیں کیا جا سکتا؟

ج: آسان سی بات ہے۔جب ذہن خود کو بگاڑ کر ارادے اور طبیعت کو اپنے تابع کر لے تو اس سے پیدا ہونے والی کسی بھی خرابی کا معالجہ محال ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہن، ارادہ اور طبیعت مل کر انسان کو مکمل کرتے ہیں۔ان تینوں میں پیدا ہونے والا ایک ہی بگاڑ انسان کے کل کو مسخ کر دیتا ہے۔جو خرابی انسان کو پورے کا پورا اپنی لپیٹ میں لے لے وہ کسی تدبیر سے دور نہیں کی جا سکتی۔یاد رکھیں علاج کا پہلا اصول مریض کی آمادگی ہوتا ہے۔مریض آمادہ نہ ہو تو ہر دوا اور ہر تدبیر بے اثر ہے۔مکر ایک ایسا مرض ہے جو مریض کی آمادگی کی ہر صلاحیت کو فنا کر دیتا ہے، یعنی طبیعت پر اس کا غلبہ ہے، ارادے پر یہ حاکم ہے، ذہن پر اس کا تسلط ہے۔ایسی صورت میں آمادگی کہاں سے پیدا ہو؟ یہ ہے سارا مسئلہ جس نے ہم سے اوپر کہی گئی باتیں کہلوائیں۔

س: مکمل مایوسی کا اظہار کرنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ مکر کو براہِ راست ہدف بنائے بغیر آدمی کے اندر دبے ہوئے کسی داعیۂ خیر کو ابھار دیا جائے۔ اس کے ابھرنے سے کیا یہ ممکن نہیں کہ اسے اس لعنت سے نجات مل جائے؟

ج: ہماری نظر میں یہ جذبہ ٹھیک ہے مگر جو تدبیر آپ تجویز کر رہے ہیں وہ بہت اچھی اور نہایت سادہ ہونے کے باوجود مکاری کی خرابی پر شائد اثر انداز نہ ہو سکے۔ پہلے اس کی وجہ سن لیں۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ مکر وہ بگاڑ ہے جو آدمی کے وجود میں دور دور تک کسی ایسی قوت کو باقی نہیں رہنے دیتا جو اس کے خلاف اٹھ سکے۔ یہ چیز مکر کی بناوٹ میں داخل ہے، البتہ ہمیں اپنے خیال میں اتنی لچک ضرور پیدا کر لینی چاہیے کہ ہم اس امکان کو تسلیم کر لیں کہ انسانی لاشعور میں خیر اور نیکی کی کچھ نامعلوم اور نامحسوس صلاحیتیں یا قوتیں چھپی ہوتی ہیں۔ اگر حکمت، بصیرت اور صوفیا کی زبان میں روحانی تصرف کے ساتھ اِن صورتوں کو بیدار کر کے شعور میں لے آیا جائے تو مکر کے غلبے کا توڑ ہو سکتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ایسے آدمی کے بعض مفادات پورے کر دیے جائیں اور ساتھ ساتھ اس میں حسِ تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ حس جو انسانیت کی بنیاد ہے، پیدا ہو گئی تو مکر کے پھیلائے ہوئے جال میں ایک بڑا رخنہ پڑ جائے گا۔ اس رخنے سے آہستہ آہستہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جیسے جیسے حسِ تعلق قوی ہوتی جائے گی مکر کا زور ٹوٹتا جائے گا۔ یہ بات آپ کے سوال سے سوجھی ہے، اس کے لیے آپ کا شکریہ۔

دوسری چیز یہ بھی دیکھ لینی چاہیے کہ بعض اوقات آدمی میں مکاری وعیاری کے

جراثیم تو پیدا ہو جاتے ہیں مگر وہ پوری طرح ان کی لپیٹ میں نہیں آیا ہوتا۔ مذکورہ بالا تدبیر ایسے شخص پر اچھی طرح کارگر ہو سکتی ہے۔

س: بعض اوقات مکر لاشعوری اور غیر اختیاری بھی ہوتا ہے مثلاً ہسٹیریا وغیرہ میں۔ اس کا بھی کوئی علاج بتائیں؟

ج: جس چیز کو آپ لاشعوری اور غیر اختیاری مکر کہہ رہے ہیں وہ محض عرف عام میں مکر ہے، ٹیکنیکل سطح پر اسے مکر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ایک بیماری ہے، عذر ہے، اسے رفع کرنے کی طبی صورتیں اختیار کرنی چاہئیں۔

س: مکر کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

ج: مکر کرنے والے پر نبی کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے(۱)۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے مکر کو فساد فی الارض کا سبب قرار دیا ہے(الاعراف ۷:۱۲۳) اسے دھوکے کی ٹٹی قرار دیا ہے۔ (الرعد ۱۳:۳۳) اور اس کا نتیجہ آخرت کا شدید عذاب قرار دیا ہے۔(فاطر ۳۵:۱۰)

۞۞۞

... ... ماجاء فی الخیانۃ والغش

عدم یکسوئی

حکم ربّانی

— ﴿قَدْاَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾

(المومنون۲۳:۱،۲)

وہ ایمان والے یقیناً فلاح پائیں گے جو اپنی نمازیں خشوع کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

— ﴿وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَیَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا﴾(الاسراء۱۷:۱۰۹)

اور وہ منہ کے بل اللہ کے حضور گرگڑاتے ہیں، ان کی آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں اور قرآن ان کے خشوع کو بڑھادیتا ہے۔

فرمان نبوی

— ''سئل النبی ﷺ عن الوسوسة، قال:تلک محض الایمان''(۱)

نبی کریم ﷺ سے وسوسہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ تو ایمان کی نشانی ہے۔

— ''عن ابی هریرة ان رسول اللّٰه دخل المسجدفدخل رجل فصلی فسلّم علی النبی ﷺ فرد، فقال:ارجع فصل فانک لم تصلِّ، فرجع فصلی کماصلی،ثم جاء فسلم علی النبیؐ.فقال:ارجع فصل فانک لم تصل"ثلاثا"،فقال،والذی بعثک بالحق ما احسن غیره فعلمنی ۔ فقال:اذاقمت الی الصلوة فکبّر،ثم اقرأ ما تیسّر معک من القرآن ، ثم ارکع حتی تطمئن راکعاً،ثم ارفع حتی تعتدل قائماً، ثم اسجدحتی تطمئن ساجداً،ثم ارفع حتی تطمئن جالسا،وافعل ذلک

(۱) صحیح مسلم،کتاب الایمان،باب بیان الوسوسة فی الایمان

فی صلاۃ کلھا''(۱)

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ مسجد میں تشریف لائے۔ اتنے میں ایک آدمی مسجد میں آیا، نماز ادا کی اور آ کر آپؐ کو سلام کیا۔ آپؐ نے اسے فرمایا: جاؤ جا کر نماز ادا کرو، تم نے نماز ادا نہیں کی۔ وہ واپس گیا اور اسی طرح نماز ادا کی جیسے پہلے ادا کی تھی۔ پھر وہ آپؐ کے پاس آیا اور سلام کیا آپؐ نے فرمایا واپس جاؤ اور نماز ادا کرو، تم نے نماز ادا نہیں کی۔ اس طرح تین دفعہ ہوا تو اس آدمی نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ مجھے اس سے بہتر نماز پڑھنی نہیں آتی، آپ مجھے سکھا دیجیے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرو پھر (الحمد کے بعد) قرآن کریم کا کچھ حصہ تلاوت کرو، پھر رکوع کرو اور پورے اطمینان سے رکوع کرو، پھر کھڑے ہو جاؤ اور پوری طرح سیدھے ہو کر اطمینان سے کھڑے رہو، پھر سجدہ کرو اور مکمل اطمینان سے سجدہ کرو، پھر سجدے سے اٹھو تو (دوسرا سجدہ کرنے سے پہلے) اطمینان سے بیٹھو۔ اور اسی طرح ساری نماز ادا کرو۔

یکسوئی خصوصاً عبادات میں یکسوئی کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ ذہنی ۲۔ طبعی اور ۳۔ ارادی۔ اگر ان میں سے کوئی قسم بھی بندے کو نماز وغیرہ میں میسر ہو تو اس کی عبادت مائل بہ کمال کہلائے گی۔

موجودہ زمانے میں آدمیوں کی ساخت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ یکسوئی کے تینوں مدارج کا بیک وقت حاصل ہو جانا تقریباً ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ اس صورتحال میں اگر کوئی شخص محض ارادی یکسوئی پر بھی قادر ہو تو وہ عبادت کے بنیادی حق کو ایک لحاظ سے پورا کر لیتا ہے۔ ایسے آدمی کو یکسوئی نہ ہونے کا مریض نہیں کہا جائے گا۔ مشکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم یکسوئی کا آئیڈیل مفہوم اپنے عمل پر منطبق کر کے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے تشویش

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب القرأۃ للامام......

اور خلفشار پیدا ہوتا ہے اور اچھی بھلی عبادت کی ناقدری کا خطرہ رونما ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ بات پہلے ہی ذہن میں محفوظ ہونی چاہیے کہ یکسوئی کا وہ فقدان جو شرعاً مذموم ہے دراصل یکسوئی کی مذکورہ بالا تینوں قسموں کے فقدان کا نام ہے۔

اگر کوئی شخص نیت اور قصد کی قوت سے اپنے معبود کی طرف یکسو ہے لیکن یہ یکسوئی خیالات کی آمد اور طبیعت کی بیزاری وغیرہ کو ختم نہیں کر پاتی تو بھی شرعی معیار سے اس آدمی کو اپنی عبادات میں یکسو رہنے والا کہا جائے گا۔ ہاں! اگر اس کا ارادہ بھی یکسو نہیں ہے تو پھر گویا وہ عبادت نہیں کر رہا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص نماز پڑھے مگر اپنے معبود کو فراموش کر کے۔ ظاہر ہے کہ اس فعل کو عبادت کا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ عبادت کا لازمی مطلب اپنے معبود کی طرف رخ کرنا ہے خواہ ارادے سے ہو، خواہ ذہن اور طبیعت سے۔ اس اصول کی روشنی میں عبادات اپنی تمام تر عظمت اور گہرائی کے ساتھ بالکل فطری اور سہل ہو جاتی ہیں۔ یہ اصول یاد رہے کہ سچا بندہ اپنی عبادات کی طرف سے بلاوجہ کے وسوسوں کا شکار نہیں ہوتا۔ یہاں ہمارا موضوع یہ ہے کہ آج کل بہت سے نمازی ایسے ہیں جنہوں نے خود کو اس فطری یکسوئی کی استعداد سے بھی محروم کر لیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پورے شعور اور ارادے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منہ موڑ رکھا ہے۔ ان کی تمام عبادات کسی اور محرک اور سبب کی بنا پر ہیں، بندگی کا تقاضا ان سے غائب ہے۔

مختصر یہ کہ عبادات میں یکسوئی نہ ہونے کا قطعی اور حتمی مطلب یہ ہے کہ دوران عبادت بندہ اپنے معبود سے غافل رہے اور اس غفلت کا اسے علم اور احساس بھی نہ ہو۔ یعنی یہ وہ آدمی ہے جو اپنے رب کو بھلانے پر راضی ہے اور یہ غفلت بھی ارادی ہے۔ یہ صورت بہت خطرناک ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ ایک وبا کی طرف پھیلتی بھی جا رہی ہے۔

جن خرابیوں کو آدمی خود اختیار کرتا ہے ان کا علاج اس پر نہیں چھوڑا جا سکتا، البتہ ہم حفظ ماتقدم کے طور پر کچھ ایسی تدابیر کو اپنا معمول بنا سکتے ہیں جن کی برکت سے اس بیماری کے حملے سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ وہ تدابیر یہ ہیں:

۱۔ نماز کو اس کے پورے آداب کے ساتھ ادا کرنا یعنی اطمینان، سکون اور اہتمام سے۔

۲۔ قرآن سے زندہ تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ اس کی سادہ سی ترکیب یہ ہے کہ تلاوت کے دوران میں اپنی زبان میں سہی مگر خوب تکلف سے گڑگڑا کر یہ دعا مانگنا کہ یا اللہ! اس کتاب کو میری زندگی کا مرکز، میری امیدوں کا محور، میرے اعمال کا مدار اور میری آخرت کا نور بنا دے۔ یا اس طرح کی حسب حال دیگر دعائیں۔ یہ یقین رکھیں کہ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ آدمی پوری طرح ڈوب کر قرآن پڑھنے کی کوشش کرے اور بیچ بیچ میں اللہ تعالیٰ کو پکارے اور اس کے بعد بھی قرآن اس کا حال نہ بنے۔

۳۔ ہر عبادت کے آغاز اور دوران میں حدیث احسان کو ذہن میں تازہ کرنا۔ عبادات میں یکسوئی کا یہ موثر ترین ذریعہ ہے۔

۴۔ وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کو پکارنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ سے تعلق میں بے تکلفی اور دوام پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ گھر والوں اور بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کر دینی باتیں کرنی چاہئیں۔ اس طرح دین ایک زندہ اور سب پر ترجیح رکھنے والی حقیقت کی حیثیت سے شعور، ارادے اور طبیعت میں قائم ہو جاتا ہے اور اس میں محبوبیت کا رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات محتاج تشریح نہیں کہ دین کی محبت حاصل ہو جائے تو

عبادات میں یکسوئی نہ ہونے کا امکان بھی باقی نہیں رہتا۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ اور صحابہ کرامؓ اور سلف کے تذکروں کا مطالعہ آدمی کی اندرونی بناوٹ کو بندگی کی روح سے ہم آہنگ کردیتا ہے۔ ہماری رائے میں ایسے علم کی تحصیل اکثر فنی علوم سے زیادہ افضل اور نافع ہے۔

س: عبادات میں یکسوئی کا فقدان کسی نفسیاتی عدم توازن سے بھی تو پیدا ہوسکتا ہے. اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: نفسیاتی عارضے سے پیدا ہونے والی عدم یکسوئی شرعاً عذر ہے اور عبادات کی قبولیت کو متاثر نہیں کرتی۔ یہ ضرور ہے کہ ایسا شخص اپنی عبادات کی طرف سے مطمئن نہیں رہتا اور یہ بے اطمینانی اسے عبادات سے دور بھی کرسکتی ہے تاہم یہ کوئی شرعی خرابی نہیں ہے۔ ہم اس کے علاج میں کچھ باتیں عرض کرسکتے ہیں لیکن عام طور پر نفسیاتی بیماریاں بہت پیچیدہ اور انفرادی ہوتی ہیں، اس لیے ایسے آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کرے۔

س: اوپر آپ نے یکسوئی کی تین قسمیں بیان کی ہیں یعنی ذہنی، طبعی اور ارادی۔ ایک عام آدمی شائد انہیں نہ سمجھ سکے لہٰذا بہتر ہوگا کہ ان کی کچھ وضاحت کردی جائے۔

ج: ذہنی یکسوئی کا مطلب ہے عبادات میں کوئی ایسا خیال نہ آنا جو اس عبادت کی مجموعی فضا سے خارج ہو مثلاً اپنے کسی مسئلے کا، کسی کام کا یا کسی چیز کا خیال۔ طبعی یکسوئی کا مطلب ہے عبادت کے دوران میں عبادت کی طرف راغب رہنا اور اس سے مختلف کیفیات قبول نہ کرنا۔ ارادی یکسوئی کا مطلب ہے عبادت کی نیت کا حاضر رہنا۔

س: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نماز وغیرہ میں جو وساوس آتے ہیں وہ یکسوئی کے فقدان پر دلالت کرتے ہیں، کیا یہ خیال صحیح ہے؟

ج: یہ خیال بالکل غلط ہے۔ وساوس غیر اختیاری ہوتے ہیں اور غیر اختیاری چیزیں شرعاً قابل مواخذہ نہیں ہوتیں۔ ان کی وجہ سے بس یہ ہوسکتا ہے کہ بندہ کمالات عبادت تک رسائی حاصل نہ کرسکے۔ جب تک آدمی وسوسوں پر راضی نہیں ہے اسے عدم یکسوئی سے حفاظت حاصل ہے جو عبادت کی روح کو غارت کر دیتی ہے، لہذا یہ کوئی ایسا مرض نہیں ہے جس کے علاج کو لازمی گردانا جائے۔ یہ ٹھیک ہے ایسی کوشش کرتے رہنا چاہیے جن سے وساوس کا راستہ بند ہوسکے لیکن یہ کوششیں گناہ سے بچنے سے زیادہ کمالات کے حصول کے لیے ہوتی ہیں۔ ان کوششوں کی ایک مختصر سی فہرست یہ ہے:

- عبادات کی ادائی سے پہلے وساوس سے محفوظ رہنے کی دعا کرنا
- نماز اور تلاوت میں الفاظ کی صورت کو تصور میں لانا
- عبادات میں رونے کی کوشش کرنا

- نماز میں لمبا رکوع اور لمبا سجدہ کرنا
- وساوس کی آمد پر دل کی زبان سے اللہ کا شکر ادا کرنا کہ ان پر پکڑ نہیں ہوگی

وسوسے کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ ذہن میں رہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی مذمت نہیں فرمائی بلکہ الٹا اسے ایمان کی نشانی قرار دیا ہے(۱) البتہ اسے نقیض کمال قرار دیتے ہوئے (۲) اس سے تعوذ کا حکم دیا ہے۔ (۳)

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسة فی الایمان

۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب کراھیة الوسوسة

۳۔ جامع ترمذی، ابواب الدعوات، باب دعاء العرفة

یہ کتاب

ایک مسلمان کا ہدف اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ معصیت اور رذائل سے بچ جائے لیکن جھوٹ، غیبت اور کبر جیسے بہت سے گناہ ایسے ہیں جن میں انسان مبتلا ہوتا ہے لیکن اسے ان کا شعوری احساس نہیں ہوتا اور بسا اوقات علم ہو بھی جائے تو اسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ ان پر قابو کیسے پائے اور ان سے کیسے بچے؟ 'ترک رذائل' ایک کوشش ہے ان لوگوں کو مدد دینے کی جو رذائل سے بچنا چاہتے ہیں۔ اسے پڑھ کر انہیں ان رذائل کا شعوری احساس ہوگا، ان میں مبتلا ہونے کے نفسیاتی اسباب اور نقصانات کا پتہ چلے گا اور ان سے بچنے کی تدبیریں معلوم ہوں گی۔ ان تدبیروں پر عمل کر کے وہ رذائل سے بچ سکتے ہیں۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم نے مرتب کو فون پر بتایا کہ انہوں نے اس کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے۔ 'ترک رذائل' کے بعد 'اکتساب فضائل' بھی زیر تصنیف ہے۔

احمد جاوید

محقق صوفی، مربی، عالم، دانشور، ادیب، شاعر، ماہر اقبالیات۔ احمد جاوید صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جدید نفسیات و فلسفہ کے بھی ماہر ہیں اور تزکیۂ نفس کی کلاسیکی صوفی روایت کے بھی شناور ہیں۔ تربیت اور انسان سازی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ تزکیہ و تربیت کے جدید و قدیم علوم و اسالیب کے حامل ہونے کے علاوہ جس چیز نے انہیں منفرد بنا دیا ہے وہ یہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تصوف کی مروجہ خرابیوں سے بچنے کی توفیق دے رکھی ہے۔ ان کی سادگی اور بے نفسی کا یہ عالم ہے کہ ان میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمد امین قدیم و جدید کے ماہر اور علوم اسلامی کے استاد، محقق اور مصنف ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ معارف اسلامی سے وابستہ رہے۔ آج کل یونیورسٹی آف مینجمنٹ و ٹیکنالوجی لاہور میں اسلامی فکر و تہذیب کے صدرِ شعبہ ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے آپ کی پی ایچ ڈی 'اسلام اور تزکیۂ نفس' کے موضوع پر ہے جسے اردو سائنس بورڈ نے طبع کیا ہے۔ پچھلی ربع صدی سے اصلاح تعلیم کی تحریک چلا رہے ہیں جس میں ان کے پیش نظر نسل نو کی اسلامی تربیت ہی ہے۔

تحریک اصلاحِ تعلیم (ٹرسٹ)

A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور

0300-4609522, 0300-4354673

Rs. 350.00